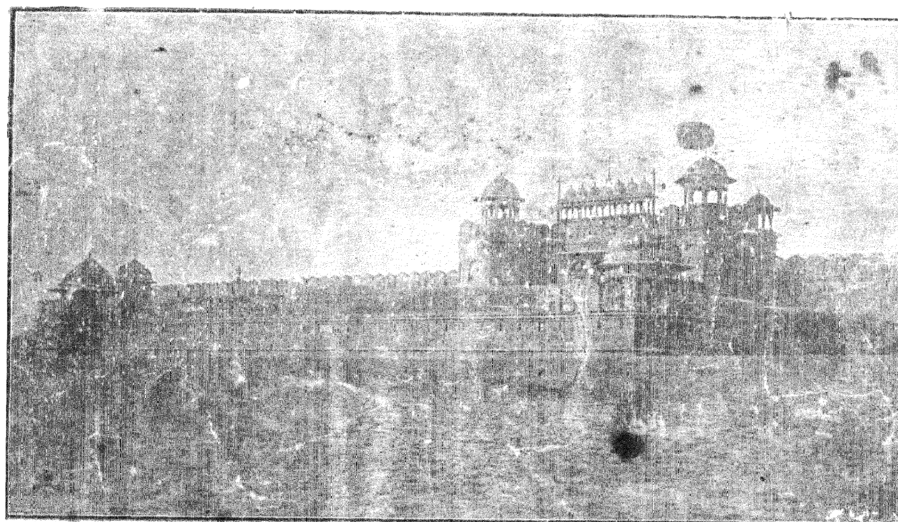
جلد دوم بابت جولائی سنہ ۱۹۲۲ء حصہ ہفتم

اردو



انجمنِ ترقی اردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

بنگالی زبان و ادب کا نشو و نما

از

جناب ڈاکٹر دنیش چندر سین صاحب رائے بہادر

(تعارف)

ڈاکٹر دنیش چندر سین صاحب بنگال کے اُن نامور اہلِ قلم میں سے ہیں جن پر اہلِ بنگال کو بجا طور پر فخر ہے۔ اِن کی تصانیف کی شہرت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ یورپ و امریکہ تک پہنچ چکی ہے اور نامور مستشرقین اور علما انھیں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نومبر ۱۸۶۶ء میں ضلع ڈھاکہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں بگجوری میں پیدا ہوئے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بنگال کے اکثر نامور فرزندوں کا جنم بھوم مشرقی بنگال ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شہرت و ناموری اُنھوں نے مغربی بنگال میں آکر حاصل کی۔ اِن کی ولادت ان کے نانا منشی گوکل کرشن سین وکیل عدالت ڈسٹرکٹ جج کے گھر میں ہوئی۔ منشی صاحب موصوف صاحبِ اثر اور صاحبِ دولت تھے اور اُس علاقہ میں اُن کی بڑی شہرت تھی۔ منشی کا لفظ بھی قابل لحاظ ہے۔ یہ بھی مسلمانوں کے تمدن کی یادگار ہے۔ جس طرح ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں لکھے پڑھے قابل اصحاب کے نام کے ساتھ (خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان) استعمال کیا جاتا تھا، اِسی طرح بنگال میں بھی اس کا رواج تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے بزرگ قنوج کے رہنے والے تھے اور ۸۰۰ء میں راجہ آدی سور کی دعوت پر بنگال میں آکر آباد ہوئے۔ آپ کے ایک بزرگ دھوی نام مشہور شاعر گزرے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے والد ایشور چندر سین برہمو سماجی تھے اور مدرسہ میں مدرس تھے۔ اور انگریزی سنسکرت، فارسی اور بنگالی زبان کے اچھے خاصے عالم تھے۔ یہ اپنے ماں باپ کے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے تھے۔ اِن کے گیارہ بیٹیاں ہوئیں مگر زندگی کا پھل بیٹا نصیب نہ ہوا۔ بیچاری ماں نے کیسی کیسی منتیں مانیں کیا کیا دعائیں کیں، تب کہیں جا کر سوتے نصیب جاگے اور بیٹا پیدا ہوا۔ ایسے بیٹے کی پرورش میں جیسے کچھ لاڈ پیار اور چاؤ چوچلے ہوئے ہوں سو کم ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے والد بھی شعر کہتے تھے اور اُنھوں نے بنگالی زبان میں بعض دعائیں اور روحانی گیت لکھے ہیں۔ لیکن قدیم بنگالی شاعری کا ذوق اُن کے دل میں اُن کی بیوہ بڑی بہن نے پیدا کیا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ تین سال کا بچہ جسے اُس کی بہن پرانے قصے اور گیت اور رامائن کی نظمیں اور وشنوی شعرا کے بھجن پڑھ پڑھ کر سنا رہی ہے، ایک دن بنگالی زبان کا نامور مورخ ہوگا۔ اور اپنی عزیز زبان کی از یاد رفتہ پرانی نظموں کو پھر زندہ کریگا۔ اِس کے بعد اُن کے مہربان اُستاد پورنا چندر سین نے اس ذوق کو اور پختہ کردیا اور ان کی بدولت اس خوش نصیب لڑکے نے مشہور قدیم بنگالی شعرا کا کلام پڑھا جن کا اثر عمر بھر رہا۔

۱۸۸۵ء میں جب کہ وہ ڈھاکہ کالج میں بی اے کی درجہ میں تعلیم پا رہے تھے ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ دو ہی مہینے بعد ان کی ماں بھی اس جہانِ ناپائدار سے رحلت کر گئیں۔ یہ سال ان کے لیئے بہت ہی منحوس ثابت ہوا۔ اِن کی دو جوان بہنوں کا یکایک انتقال ہوگیا۔ خود اُن پر فالج گرا اور ان کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ رفتہ رفتہ وہ پھر تندرست ہوگئے اور سلہٹ کی ایک تحصیل ہبی گنج میں مدرسی کی خدمت پر تقرر ہوگیا۔ یہاں اُنھوں نے انگریزی شعرا کے کلام کا خوب مطالعہ کیا۔

۱۸۸۹ء میں اُنھوں نے بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور کومِلا (ضلع ٹپرا) کے وکٹوریا اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے جہاں وہ اسی خدمت پر ۱۸۹۶ء تک رہے۔ اِس زمانہ میں اُنھوں نے اپنی فرصت کا وقت بنگال کے قدیم شعرا کے بھولے بسرے کلام اور قلمی نسخوں کو جمع کرنے اور ترتیب دینے میں صرف کیا۔ اور بنگالی زبان و ادب کی تاریخ کا سامان اُنھوں نے ایک مستعد

طالب علم اور پُرجوش اور سچے عالم کی طرح مہیا کرنا شروع کیا۔ اس کام میں انھیں اس قدر انہماک
تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے میں دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعصاب کی
کمزوری سے اُن کی صحت خراب ہو گئی۔ لیکن باوجود صحت کی خرابی کے اُنھوں نے بنگالی شعرا کے
کلام کا سلسلہ مرتب کر ڈالا۔ لارڈ کرزن نے مسٹر سین کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور اُن کے لیئے
سرکار سے ایک وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ وظیفہ اگرچہ کم تھا مگر علم کے ایک ایسے خدمت گزار کے لیئے جو
محنت سے چور اور صحت سے مجبور ہو گیا تھا نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ لیکن اب زمانے نے پلٹا کھایا۔ ان
کی کتابوں کی رفتہ رفتہ شہرت ہوئی اور اچھے اچھے لوگ مصنف کی قدر کرنے لگے۔ ان کی بعض بنگالی
کتابیں مدارس کے نصابِ تعلیم میں بھی داخل ہو گئیں جس سے انھیں مالی فائدہ بھی ہوا۔ سر آسوتوش
مکرجی وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی کی عنایت سے ۱۹۰۹ء میں انھیں یونیورسٹی میں ایک مناسب خدمت مل گئی
یعنی وہ بنگالی ادب کے "ریڈر" ہو گئے۔ اس خدمت پر آکر اُنھوں نے لکچروں کا ایک سلسلہ دیا اور انہی
لکچروں سے "بنگالی زبان و ادب کی تاریخ" مرتب کی۔ ۱۹۰۹ء میں وہ اپنی یونیورسٹی کے فیلو منتخب
ہوئے اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ایسوشی ایٹ ممبر انتخاب کیئے گئے۔ اسی سال کلکتہ یونیورسٹی
نے ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلز کی تقریب تشریف آوری پر "ڈاکٹر آف لٹریچر" کا خطاب دیا۔ اور
گورنمنٹ نے "رائے بہادر" کا خطاب عطا فرمایا (رائے صاحب یہ بہت پہلے سے تھے)۔ ندیا
کی علمی انجمن بدھیا جنانی سبھا نے (ندیا سنسکرت علوم کا مرکز ہے) چند سال ہوئے "کوئی شکھار"
یعنی ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا اور حال میں "بھارت دہرم مہامنڈل" نے "پرتن تتوا بھوشن"
کا خطاب دیا۔ ڈاکٹر صاحب درحقیقت ان تمام خطابات کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر دنیش چندر سین نے اپنی تصنیفات و تالیفات اور خاص کر "بنگالی زبان و ادب کی
تاریخ" سے بنگالی زبان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ کارنامہ ان کا ایسے اعلیٰ درجہ کا ہے کہ ہندوستان
کی کسی زبان میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اِن کی تاریخ پر یورپ کے نامور مستشرقین اور علما و فضلا نے
ایسی بیش قدر اور اعلیٰ درجہ کی رائیں لکھی ہیں کہ جو شخص اس کتاب کی قدر و قیمت اور مصنف کی

بے نظیر قابلیت اور حیرت انگیز تلاش و جستجو سے واقف ہو وہ ان رائوں کو انتہا درجہ کا مبالغہ خیال کریگا۔ ڈاکٹر سلون لیوی جیسا فاضل متبحر اور دوسرے فضلا جن کی علمیت و فضیلت کو دنیا تسلیم کر چکی ہے اس کتاب کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور انھوں نے جو رائیں لکھی ہیں وہ اُن کے خیالات کا آئینہ ہیں۔ افسوس ہے کہ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ان کا مختصر سا اقتباس بھی درج کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ یورپ و امریکہ کے سینکڑوں علمی رسالوں نے اس کتاب کی مدح و ستایش میں مفصل تحریریں لکھی ہیں۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو اچھی خاصی کتاب بن جائے۔

اِس تاریخ زبان کے علاوہ اُنھوں نے نہایت قابلِ قدر کام یہ کیا ہے کہ قدیم بنگالی ادب میں سے موزونیت کے لحاظ سے انتخابات جمع کیئے ہیں۔ یہ کتاب خاصی بڑی تقطیع پر دو ہزار صفحہ کی ہے۔ اس پر اُنھوں نے سو صفحہ کا ایک بسیط مقدمہ لکھا ہے۔ اس کے سوا بنگالی رامائنوں پر دو سو پچاس صفحہ کی کتاب لکھی ہے جس پر سر جارج گریرسن نے جو ہندوستان کی زبانوں کے بہت بڑے محقق اور عالم ہیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ میں بہت بڑا ریویو لکھا ہے اور اس محققانہ کتاب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ ساڑھے تین سو صفحے کی ایک اور کتاب بنگال کے اُن گیتوں پر ہے جو عوام میں مشہور ہیں۔ اسی طرح تین سو صفحہ کی ایک کتاب وشنوی بنگالی ادب پر لکھی ہے۔ اِن کتابوں کی بھی بے حد تعریف کی گئی ہے۔ غرض اِس قسم کی دس کتابیں اُن کی قلم سے انگریزی میں شائع ہوئی ہیں اور ہر کتاب اپنی نظیر آپ ہے۔ علاوہ ان کتابوں کے جو انگریزی میں ہیں تیس کتابیں بنگالی زبان میں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ اِن سے ڈاکٹر صاحب کی علمی قابلیت و فضیلت اور اُن کی محنت اور عالمانہ تحقیق اور اُن کے علمی ذوق و شوق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ مضمون "بنگالی زبان و ادب" پر جو اس کے بعد شائع کیا جاتا ہے اِسی فاضل ڈاکٹر کا لکھا ہوا ہے۔ جو ہماری درخواست پر اُنھوں نے تحریر فرمایا ہے۔ مضمون وصول ہونے پر بعض دیگر اُمور کی طرف اُن کی توجہ مبذول کرائی گئی کہ ان پر بھی وہ کچھ تحریر فرما کر مضمون میں شامل کر دیں۔

چونکہ مضمون لکھا جا چکا تھا۔ اور اس میں دوسرے امور کے شامل کرنے سے مضمون کے تسلسل اور روانی میں فرق آتا تھا لہذا ان پر الگ اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تاکہ بطور حواشی کے اصل مضمون کے ساتھ شائع کر دیئے جائیں۔ اس مختصر مگر فاضلانہ مضمون کے پڑھنے سے اُردو داں طبقہ کو معلوم ہوگا کہ بنگالی زبان نے رفتہ رفتہ کیونکر ترقی کی۔ اور اب کس درجہ پر ہے۔ اور ملک کی زبانوں میں اُس کی کیا حیثیت ہے۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کی ایک آدھ زبان بنگالی کی ہمسری کا دعویٰ کرے مگر بنگالی کو جو بات اس وقت نصیب ہے وہ کسی دوسری زبان کو نہیں۔ بنگال نے چند ایسے عالی دماغ اور عالی خیال فرزند پیدا کیے ہیں کہ اُن کے کلام کو قبول عام حاصل ہے اور اہل عالم اُن کے ترجمے سر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور حرز جاں اور وردِ زبان کرتے ہیں۔ یہی لوگ زبان کے بنانے والے اور اُس کی وقعت بڑھانے والے ہیں۔ دوسری زبانیں پہلے ایسے سپوت پیدا کرلیں پھر ہمسری کا دعویٰ کریں۔

(اڈیٹر)

۱۔ قدیم بنگالی علم ادب نویں صدی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک

ہمارے پاس قدیم بنگالی شاعری کا ایک عجیب و غریب ذخیرہ موجود ہے جس کا نویں صدی عیسوی سے آغاز ہوتا ہے۔ ہماری ترقی پذیر تہذیب کی طرح اس علم ادب کے بھی مختلف دور ہیں اور ہر دور اُن قوتوں کا پتہ دیتا ہے جن سے ہماری قومی زندگی بنی اور اُس نے تدریجی نشو و نما حاصل کی۔ چنانچہ پہلا دور یا پہلی منزل یہ نشان دیتی ہے کہ ضبط نفس و ترک دنیا جو بدھ مت کے اصولِ متعارفہ ہیں اُس علم ادب کے وسیع حصے پر چھائے ہوئے تھے۔ جسے عام طور پر ناتھ کی پوجا کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ دوسری منزل میں یہ تماشا نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو تبت و برما۔ آہم ٹپرا۔ اور دوسری قوموں اور دیسوں کے دیوتا اور دیبیاں جدّ و جہد کر رہے ہیں کہ ہندو دیوتاؤں میں داخل ہو جائیں اور دوسری طرف وہ لوگ جو برہمنی مت کے احیا کے باعث ہوئے اس جد و جہد کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ پھر تیسرا

دور آتا ہے جس میں اسلام کا اثر صاف صاف دکھائی دیتا ہے کہ کس طرح خدائے واحد (مجسم) کے عقیدہ کی ترقی ہوئی درآں حالے کہ یہ عقیدہ "ہمہ اوست" کے عام میلان کے بالکل خلاف تھا جس میں زمانۂ بعد میں اس عقیدہ کو عامتہ الناس ان نازک ذہنی تصوّرات کے ہم معنی اور مرادف سمجھنے لگے تھے جس سے عقیدہ میں وسواس پیدا ہونے لگتا ہے اور آدمی متشکک سا ہو جاتا ہے۔

ہمارے علم ادب کا سب سے ممتاز دَور چوتھا ہے جس کا آغاز وشنویوں سے ہوتا ہے جنھوں نے سولھویں صدی عیسوی میں اسلام کے اثر سے متأثر ہو کر سوسائٹی کے شیرازہ کو اتحاد و اُخوّتِ عامّہ کے اُصول پر دوبارہ درست کیا۔ وشنویوں[1] کے ادب میں فطرتِ انسانی کی نزاکت، اِس کی حُسن کی لطافت اور نفاست کی تصویر اس خوبی سے کھینچی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بلند تر پایہ کمال کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ یورپ کی ایک بڑی عالمہ اور مُصنفّہ مس مارگریٹ نوبل کے قلم سے بھی ایک دفعہ یہ جملہ نکل گیا کہ "بنگال کے وشنویوں نے جذباتِ لطیف اور نازک خیالیوں کے سرچشموں کو خشک کر دیا ہے"۔ اس زمانہ میں بھی سر رابندر ناتھ ٹگور نے اِسی وشنوی چمن سے گل چینی کی ہے۔ وشنویوں کے آخری متبعین کے ہم عصر شاکت[2] تھے۔ جنھوں نے اپنے مذہبی اُصولوں کی تفسیر توضیح اور اپنی نظموں اور گیتوں کے ذریعہ سے ہماری زبان کی ترقی کے میدان میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

یہ تمام علم ادب جیسا کہ اس گزشتہ زمانے میں تمام عالم کا تقاضا تھا، کم و بیش مذہبی رنگ سے رنگا ہوا تھا۔ بنگال میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے بھی علم ادب کی ترقی میں ساتھ دیا۔ اس زمانہ میں ان دونوں قوموں میں باہمی مدارات اور رواداری کے خیالات اس قدر قوی تھے کہ آج کل کی سیاسی معاملات میں حصہ لینے والوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ بہت سی بنگالی تصنیفیں موجود ہیں جن میں ایسے مُسلمان بزرگوں کے حالات درج ہیں جنھیں ہندو مُسلمان دونوں مقدّس سمجھتے تھے۔

ہمارے قدیم علمِ ادب میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو فنا نہیں ہو سکتیں اور زمانۂ حال کے معیارِ تنقید کی کسوٹی پر بھی کھری اُتریں گی۔ مسٹر کا دل آں جہانی نے جب کہ وہ سولھویں صدی کے ایک مصنف مکند رام کی چنڈی کویا کا ترجمہ کر رہے تھے۔ اس بنگالی شاعر کا چاسر سے مقابلہ کیا ہے اور اس کی قوتِ بیان کیرکٹر نویسی

---

[1] وشنو کے پجاری (اڈیٹر) [2] شکتی یعنی کالی۔ اس کے پجاری شاکت کہلاتے ہیں (اڈیٹر)

اور باطنی حسن شاعری کی مدح سرائی کی ہے۔ مس مارگریٹ نوبل جنھوں نے اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک بنگالی شاعر رام پرشاد سین کے کلام پر تنقید لکھی ہے اور اس کی بعض نظموں کا ترجمہ بھی کیا ہے اس شاعر کو ولیم بلیک اور وٹمین سے بھی اعلیٰ پایہ خیال کرتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جس زمانہ میں مغربی اقوام اپنی سخت محنت اور اولوالعزمیوں کی بدولت مادّی عروج حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ہمارے اہل ملک ہندو اور مسلمان اپنی ریاضاتِ شاقہ صوم وصلوٰۃ اور شب بیداریوں کے ذریعہ روحانی عقدوں کے حل کرنے میں مصروف تھے۔ یہ دونوں قومیں تہذیب وتمدن کے دو مختلف راستوں پر گام زن تھیں اور یہی بنیادی فرق ہے جو مشرق و مغرب کے علوم ادب میں بیّن طور پر نمایاں اور واضح نظر آتا ہے۔ اس ہزار برس کی مدت میں ہماری زبان میں جو کتابیں تصنیف و تالیف ہوئی ہیں اُن میں سے سینکڑوں قدیم کتابیں اب ہمارے ہاتھ لگی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کیا بہ لحاظ تاریخ یا ادب کے اور کیا باغراض سائنس کے یہ تصنیفات نہایت وقیع اور بلند پایہ ہیں۔

۲۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے تحتِ اثر بنگالی زبان کی ترقی

۱۸۰۰ء سے جب کہ لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی ہمارے علم ادب نے ایک دوسری ہی صورت اختیار کی علمائے یورپ، عمدہ داران سول سروس اور پادریوں نے کیری (Carey)، ہالھڈ (Halhed) اور ولکنس (Wilkins) جیسے اَن تھک لوگوں کی سرکردگی میں ہماری توجہ کو مادّی عالم اسباب کی طرف متوجہ کیا اور خود بنگالی زبان سیکھ کر اس میں ادبی، تاریخی اور سائنٹیفک (علمی) مضامین پر کتابیں لکھنا شروع کیں۔ نصف صدی تک یہ سرگرمی قائم رہی اور اُن کے جوش اور مستعدی میں کمی نظر نہ آئی اگر آپ بنگالی کتابوں کی وہ فہرست اُٹھا کر دیکھیں جو پادری آئی لینگ نے مرتب کی تھی اور جس کی اشاعت ۱۸۵۵ء میں ہوئی تو آپ کو حیرت ہوگی کہ ہمارے یورپین بھائیوں نے بنگالی نثر کے میدان میں مختلف علوم و فنون کے متعلق کس قدر سرگرمی ظاہر کی ہے۔ ان سب لوگوں میں ڈاکٹر کیری سب سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں کہ اُنھوں نے سب سے زیادہ اس کام میں دلچسپی ظاہر کی بلکہ درحقیقت اس عظیم الشان کام کے وہی پیشوا نظر آتے ہیں اُنھوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی کہ خود اپنے قلم سے بنگالی میں مستقل کتابیں لکھیں بلکہ اپنے اثر سے بہت سے مشہور بنگالی

اہل قلم کو اپنے نقش قدم پر چلنے کے لئے آمادہ کیا۔ مشہور مصنف مرتن جے، ترکالنکر، فورٹ ولیم کالج کے پروفیسروں میں سے تھے جن کے متعلق مسٹر مارشمین مورّخِ سری رامپورمشن اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ "مرتن جے علم ادب کا بحرِ ذخار ہے اور اپنے علمی تجربہ اور صحیح قوت تنقید نیز اپنے جثّے اور بھدی ناک اور نقشے کے اعتبار سے ہمارے مشہور لغت نویس (ڈاکٹر جانسن) سے بہت مشابہت رکھتا ہے" پھر ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "یہ شخص اس زمانہ کے علمائے متبحّرین سے ہے"۔ مرتن جے پنڈت نے بنگالی زبان میں ہندو فلسفہ، منطق، تاریخ اور دینی اور ادبی مضامین پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری زبان نے فورٹ ولیم کالج کے زمانہ میں اہلِ یورپ کی سرپرستی میں کہاں تک ترقی کی تھی۔ صرف اجمالاً ان چند بنگالی کتابوں کے نام گنا دینا چاہتا ہوں جو اہلِ یورپ نے ۱۸۵۵ء تک لکھیں۔ اِس فہرست میں بنگالی مصنفوں کے نام نہ ہونگے۔

پہلی بنگالی گرامر۔ مصنفہ ہالھڈ عہدہ دار سول سروس مطبوعہ ۱۷۷۶ء

ترجمہ قواعد وضوابط سرکاری بزبان بنگالی از مسٹر فاسٹر مطبوعہ ۱۷۹۳ء

پہلی بنگالی لغت:۔ مرتبہ مسٹر فاسٹر عہدہ دار سول سروس مطبوعہ ۱۷۹۹ء

اِس لغت میں اٹھارہ ہزار الفاظ تھے اور قیمت ۸۰ تھی

بنگالی لغت۔ مؤلفہ ملر مطبوعہ ۱۸۰۱ء قیمت ۵۰

بنگالی لغت۔ مؤلفہ ڈاکٹر کیری مطبوعہ ۲۵-۱۸۱۵ء چہار جلد

اِس لغت میں اسّی ہزار الفاظ تھے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی تیس برس کی لگاتار محنت کا یہ ثمرہ تھا۔

لغت۔ مرتبہ ہوٹن۔ یہ تمام ماقبل کی تالیفات سے بڑھ گئی ۱۸۲۵ء میں یہ طبع ہوئی اور ۸۰ قیمت قرار پائی۔

ریاضی۔ ۱۸۱۷ء مسٹر مے نے اس فن پر ایک رسالہ لکھا جس کا نام "مے گنیتا" رکھا۔ پھر ہاری صاحب نے گنی تنکا (یعنی اعداد ریاضی) لکھی جو ۱۸۱۹ء میں طبع ہوئی۔

اخلاقی افسانے۔ سدگن، برجر، اتہاس (یعنی بہادری اور نکوئی کی کہانیاں) جو سیرامپور کے

ایک یورپین مشنری نے لکھی تھی اور ۱۸۲۹ء میں طبع ہوئی۔ ایساپ فیبل (حکایاتِ لقمان) کا ترجمہ ۱۸۳۴ء میں مسٹر مارشمین نے بنگالی زبان میں کیا اور پادری آئی۔ رابنسن نے ۱۸۵۰ء میں رابنسن کروسو کا ترجمہ کیا۔

جغرافیہ۔ پیرسن صاحب کا بنگالی جغرافیہ مطبوعہ ۱۸۲۵ء۔ جی ہرکلوٹ صاحب کا مکالمہ جغرافیہ پر (بہ زبان بنگالی) مطبوعہ ۱۸۲۴ء۔ اس جغرافیہ میں دوسرے مضامین کے علاوہ کرۂ ارض، نظامِ شمسی، دم دار ستارے، خسوف و کسوف، مدّ و جزر، برق، قوس قزح، قطب نما، اور شہابِ ثاقب کے حالات بھی لکھے گئے ہیں۔ پیرسن صاحب کی کتاب "بھوگل پردنتا" (مطبوعہ ۱۸۱۸ء) میں کرۂ ارض کا حال بطور ایک سیّارے کے درج ہے اور اس کی حرکت اور شکل وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے۔ سینڈھی صاحب کا جغرافیہ بزبان بنگالی، اس کتاب میں بہ شکل سوال و جواب فلسطین، ارض یہودا، بنگال کے ۲۳ ضلعے، اُن کی مردم شماری۔ تجارت اور انگلستان کا عام جغرافیہ ہے۔ ۱۸۲۴ء میں یہ طبع ہوئی۔

تاریخ (اتی ہاس سمی چائی) مؤلفہ پیرسن صاحب اس کتاب میں آسان بنگالی زبان میں مصر، شام، بابل، میڈیا، ایران، یونان، اور رومتہ الکبریٰ کے حالات درج ہیں۔ ۱۸۳۰ء میں طبع ہوئی۔

مارشمین صاحب کی تاریخ بنگالہ (بنگا بھاسر پورا برتّا) کا ترجمہ جسے وینگر صاحب نے انگریزی سے بنگالی میں ترجمہ کیا۔ دانیال چرت (سوانح دانیال علیہ السلام) مؤلفہ مسٹر مارٹن ۱۸۳۶ء۔ محمد چرت (سوانح آں حضرت صلعم) مؤلفہ آئی لانگ صاحب۔

طب:۔ ہرابلی (بنگالی علم تشریح) مؤلفہ کیری صاحب۔ صفحات ۹۳۰، مطبوعہ ۱۸۲۰ء

تاریخ طبعی۔ دھنی دہار (نظام صوتی بہ زبان بنگالہ) مؤلفہ بام وٹیس مطبوعہ ۱۸۵۳ء

بنگالی ہجے۔ مؤلفہ اسٹیوا برٹ

کشترا بھاگن بیبارن (نخل بندی بنگالہ) مؤلفہ آئی مارشمین۔ اس کتاب میں چوبیس پرگنہ آسام بہار اور کشمیر کی زراعت پر بحث کی ہے۔ اور ثمر دار درخت۔ نیشکر۔ پورینا کی زراعت، کپاس، تیل، ساگوان اراروٹ، ریشم، قہوہ، تمباکو، گانجا، آلو، شفتالو، دھان اور ہاتھی چوک وغیرہ کی کاشت کا ذکر دو جلدوں میں کیا گیا ہے۔ ۳۱-۱۸۳۰ء میں طبع ہوئی۔

میک صاحب کی کیمیا، وِدّیا (بنگالی کیمسٹری)۔ اس کتاب میں کیمیائی قوتوں مانند حرارت (Caloric)

نور، برق، اشیاء کیمیائی آکسیجن، کلورین، برومن، فاسفورس، کاربن، بورن، سلینم اور دخانی انجن سے بحث کی گئی ہے۔

۱۸۳۳ء میں ایک انجمن نے جس کا نام "انجمن ترجمہ علوم یورپ" تھا پروفیسر ولسن، جے سدرلینڈ اور دیگر اہل علم کے نگرانی میں ایک بہت مفید سلسلہ تالیفات شائع کرنا شروع کیا۔ جس کا نام "بنگیا سبا دہی" تھا۔ اس سلسلہ میں ان علوم پر کتابیں تالیف و تصنیف یا ترجمہ کی جاتی تھیں۔ فلسفہ طبعی، علم ہیئت، علم جر ثقیل، میکانکز، علم مناظر و مرایا۔

مکتوب نویسی پر جے پرسن صاحب نے پترا کومادی لکھی اور اسے ۱۸۵۲ء میں شائع کیا۔ اسی مضمون پر جے لانگ صاحب نے ۱۸۵۴ء میں ایک دوسری کتاب پترابلی شائع کی۔

جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا یہ ایک بالکل محدود فہرست ہے اور گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے صرف چند یورپین مصنفوں کی تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان مصنفین کے بعد خود بنگالی مصنفین کی ایک کثیر جماعت بلکہ کہنا چاہیئے کہ فوج کی فوج میدان میں اتر آئی۔ وہ اپنی زبان میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ اس نے اس میدان میں رفتہ رفتہ تمام بیشتر و مصنفین کو مات کر دیا۔ ۱۸۰۰ء سے لے کر کچھ کم پچاس برس کی مدت میں ہر مضمون کی سینکڑوں کتابیں خود بنگالی اہل قلم کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ ان کتابوں کی ضخامت خاصی تھی اور حیاتِ نباتی و حیوانی، باغبانی، پیمائش و بندوبست اراضی، جثۂ انسانی (جیسا کہ فطرتاً اسے ہونا چاہیئے) اور دیگر طبعی اور تجربی علوم پر ضخیم ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس تنوّع سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بنگالی زبان میں تعلیم، ادب اور سائنس کے تمام شعبوں کے اصطلاحی الفاظ نویں صدی کے ابتدائی پچاس برس کے اندر کافی مقدار میں آگئے تھے، پھر نصف صدی کے آخر سے کچھ کم مدّت میں جو ترقی ظہور میں آئی اور جس قدر تیز رفتار رہی اُسے دیکھ کر اچنبا ہوتا ہے۔

۱۸۵۰ء کے بعد راجہ راجندر لال مترا اور پادری کے ایم بنرجی نے ادبی، تاریخی اور سائنٹفک مضامین پر متعدد تصنیفات شائع کر کے زبان میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اور گویا اس تحریک کی سرکردگی انھیں کے ہاتھ رہی۔ پھر ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام راجہ رام موہن رائے تھا۔ جو بنگالی برہمو سماج کا بانی بھی ہے۔ یہ سب سے بڑا بنگالی ہی نہ تھا بلکہ اُس زمانے میں دنیا کے سب سے بڑے آدمیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ۱۸۱۵ء سے ۱۸۳۳ء تک اس کے

قلم کی مدد سے بنگالی علم ادب کو بڑی ترقی نصیب ہوئی - جو اثر کہ اُن کی تصنیفات کا ہندوستان اور یورپ پر پڑا یہ سمجھنا چاہیئے کہ گویا وہ ایک جذبۂ روح شاعری تھا جس نے تمام عالم میں شگفتگی پیدا کر دی - جب یہ لندن تشریف لے گئے تو سر جان بورنگ جنھوں نے ان کی خدمت میں انجمن موحدین لندن کی طرف سے ایک استقبالی سپاسنامہ پیش کیا تھا، اِن الفاظ میں اُن کا ذکر کرتے ہیں "بعض اہل قلم نے خیال میں یہ تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہی کہ اگر اچانک اُن کے درمیان افلاطون - سقراط - ملٹن - یا نیوٹن آجائے تو ان پر کیا کیفیت طاری ہوگی - مجھے یاد پڑتا ہی کہ ایک شاعر نے جسے صوفی بھی کہا جا سکتا ہی اُن لوگوں کے جذبات کی ایک نہایت لطیف الفاظ میں تصویر کھینچی ہی جنھوں نے کرّۂ جنوبی میں پہنچ کر پہلی مرتبہ ستاروں کے اُس دل فریب مجموعے کا نظارہ کیا تھا جو طلائی صلیب کے نام سے موسوم ہی - اور اس نظارے سے جو کیفیت اُن پر گزری قریب قریب اسی قسم کے جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے آپ لوگوں کی جانب ہاتھ بڑھایا کہ راجہ رام موہن رائے کو مرحبا کہوں" راجہ صاحب نے اُپنشد و دیگر مسائل اصلاح معاشرت اور صرف و نحو پر اپنی سیدھی سادی بنگالی میں جس کی تقلید کرنی ممکن نہیں متعدد کتابیں لکھی ہیں -

اِس زمانہ میں ہمارے بنگالی علما نے جو کتابیں لکھیں اُن پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی - بنگالی قوم کو فیاضِ ازل نے بہت اچھی ادبی قابلیت عطا فرمائی ہی اور اُس زمانہ کے مصنفین میں سے پنڈت مرتن جے رجب لوچن - پرماتھ سرما - اور رام رام باسو نے بعض ادبی جواہرات یادگار چھوڑے ہیں - آخر الذکر مصنف کے متعلق یورپ کا ایک نقادِ سخن بیان کرتا ہی کہ اس شخص کی تحریر گویا "ایک قسم کی پچّی کاری ہی جس میں فارسی کو بنگالی کے ساتھ وصل دیا گیا ہی"، دوسرے دس سال میں پیارے چند مترنے جو ٹیک چند ٹھاکر کے فرضی نام سے مشہور ہے اپنی شہرۂ آفاق کتاب لالر گھرٹر دلال (لاڈ پیارے کا بگاڑا لڑکا) تصنیف کی - ۱۸۵۶ء میں یہ طبع ہوئی - مسٹر جے - ڈی - آسول (Oswell) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جن کی رائے میں اس مصنف کو وہی رتبہ حاصل ہی جو انگریزی علم ادب میں تھیکرے (Thackeray) کا تھا - ایک اور انگریز کہتا ہی کہ یہ شخص بنگالہ کا مولیر (Moliere) ہی اور ایک تیسرا بیان کرتا ہی کہ اس مصنف کو فیلڈنگ سے تشبیہ دی جائے تو بجا ہے -

دورِ جدید

بنگالی علمِ ادب کی قلمرو پر ربع صدی تک بنکم چندر کی فرماں روائی رہی۔ اور جب اُن کی وفات سنہ ۱۸۹۳ء میں واقع ہوئی تو پنڈت ایشور چرن دیا ساگر اور بابو اکشی کمار دت کا دور دورہ آیا۔ بنگالی ادب کے یہ دونوں آفتاب ماہتاب تھے۔ لیکن مملکتِ سخن کے بادشاہ یعنی سر رابندر ناتھ کے منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہونے کے قبل تک ہمارے ملک میں مادھو سدن دت، ہیم چندر بنرجی اور نوین چندر سین سرآمد شعرائے زمانہ سمجھے جاتے تھے۔

بنکم چندر کے تقریباً تمام ناولوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں مشہور انگریزوں کے قلم سے ہو چکا ہے ان انگریزوں میں سب سے زیادہ مشہور فلپس (Phillips) اور ڈاکٹر اینڈرسن (Anderson) ہیں جو دونوں عہدہ دار سول سروس تھے۔ مسٹر آر سی دت آنجہانی نے بھی جو خود عہدہ دار سول سروس تھے علمِ ادب کے شعبہ افسانہ نیز علوم ویدک پر بنگالی زبان میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

ہماری زبان کا علمِ ادب اب اس درجہ تک پہنچ گیا ہے اور قدیم و جدید علوم پر اس قدر کافی مواد موجود ہے کہ ہمارے پاس کالج کی تعلیم اور اس کے بعد علمی تحقیقات کے لئے پورا سامان مہیا ہو سکتا ہے۔ ہماری زبان میں بہت سی ایسی تاریخی کتب لکھی جا چکی ہیں جو یہی نہیں کہ زمانہ حال کی جدید ترین اُصول پر لکھی گئی ہیں بلکہ جہاں تک تاریخ ہندوستان سے تعلق ہے بعض ایسے مضامین کے لحاظ سے جن پر ابھی تک کسی نے قلم نہیں اُٹھایا ہے یہ تصنیفات اہلِ یورپ کی لکھی ہوئی تاریخوں سے بھی فائق نظر آتی ہیں۔

ناگندر ناتھ باسو کی لغت علوم (یعنی انسائی کلوپیڈیا) جس کا نام "وشوا کوش" ہے ایسے مضامین سے معمور ہے جو نوعیت کے لحاظ سے جدید اور قدر و منزلت کے لحاظ سے نہایت بیش بہا سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ضخامت میں ویبسٹر ڈکشنری کی آٹھ جلدوں کے برابر ہے (قیمت ۳۰۰)۔ اب اس کتاب کا ترجمہ ہندی زبان میں کیا جا رہا ہے بابو رکشت کمار متر سی آئی ای۔ بابو نکھل ناتھ رائے۔ رام پرشاد چند۔ راکھل داس بنرجی اور رام پرتاب گپتا نے بھی بنگالی تاریخ کے میدان میں بہت کچھ نئی تحقیقات کی ہے اور چاٹگاؤں کے مولوی عبدالکریم صاحب نے قدیم بنگالی کے قلمی نسخوں کی تحقیق و تدقیق میں قابلِ تعریف خدمات انجام دی ہیں۔ مسٹر جے ایم سین گپتا کی حال کی تصنیف "ارتابم اہی ناگی"

فنونِ لطیفہ کے متعلق ایک نہایت قابل قدر کتاب ہے۔ جس میں علم ادب و فنونِ لطیفہ کے اعلیٰ مفہوم پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب اپنی خوبیوں کے لحاظ سے ہر بنگالی کے لئے مایۂ ناز ہے۔ (قیمت ۵ عـہ)

اِس سے قبل بابو اکشے کمار دت علمی (سائنٹیفک) تصنیفات میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ ایک رسالہ کے وہ اڈیٹر تھے جس کا نام تالتوا بودھنی پتریکا تھا جس میں سر رابندر ناتھ ٹگور کے والد ماجد مہارشی دیوندر ناتھ ٹگور بھی اکثر سائنٹفک (علمی) مضامین لکھا کرتے تھے۔ دیگر خصوصیات کے لحاظ سے یہ رسالہ بہت کچھ اڈیسن (Addisi n) کے اسپکٹیٹر (Spectator) اور جانسن (Jhonson) کے ریمبلر (Rambler) کے نقشِ قدم پر تھا۔

سر جے سی بوس اور سر پی سی رائے اب اپنی نئی تحقیقاتوں سے بنگالی زبان کے علم ادب کو ترقی دے رہے ہیں جو بنگالہ کے سائنٹیفک لٹریچر کے لئے آئندہ کے واسطے بہت اُمید افزا ہے۔ مطبع میٹرا پولیٹین (Metro-politon) سے سائنس کے پرائمرین (ابتدائی کتابیں) ہر روز ایک تعداد کثیر میں طبع ہو کر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ رامندر اسندر ترویدی آنجہانی اور بابو جگدا مندر رائے نے متعدد مشہور سائنس کے رسالے تصنیف کئے ہیں جو صفائی بیان اور جدید ترین معلومات کے لحاظ سے بہت مقبول ہوئی ہیں۔ جب کسی مصنف نے واقعی طور پر بنگالی زبان میں کوئی سائنس کی کتاب لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو مجھے خیال نہیں کہ کبھی اصطلاحی الفاظ کی کمی کی شکایت اِس کی زبان پر آئی ہو۔

لیکن جس چیز کی سب سے زیادہ دقّت ہم اہلِ بنگالہ محسوس کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں سائنٹیفک (علمی) ماحول کا فقدان ہے۔ سر پی سی رائے اور بعض دیگر اصحاب اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن جب تک خود ہمارے لوگ بچشمِ خود تمام کلوں کو نہیں دیکھینگے اور اُن کے عمل کے متعلق براہِ راست علم حاصل نہ کرینگے اس وقت تک ہماری معلومات میں وسعت نہیں ہو سکتی۔ ہمارا علم صرف کتابوں کے دائرہ کے اندر محدود رہیگا۔ لیکن سر آستوش مکرجی کی مخلصانہ مساعی کا بے حد شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنھوں نے بعض مشہور ابنائے وطن کی فیاضی سے ایک سائنس کالج کی بنیاد ڈالی ہے جو کلکتہ یونیورسٹی سے متعلق رکھا گیا ہے۔ اس کالج میں گریجویٹ

۱؎ فاضل مصنف نے یہاں سائنس کی تعلیم اور مشینوں کے علم کو خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ مشینوں کا تعلق حرفت و صنعت سے ہے۔ اڈیٹر

ہونے کے بعد جو لوگ آگے علمی تحقیقات کرنا چاہیں اُن کے لیئے بہت سا سامان مہیا کر دیا گیا ہی اور جو کام یہاں ہو رہا ہی وہ بہت قابلِ ستایش ہی۔ اُس کی نگرانی اور انتظام بالکلیہ سر پی سی رائے کے ہاتھ میں ہی جن کے بعض شاگردوں نے یورپ میں بھی شہرت حاصل کی ہی اور جہاں تک علوم کیمیا کا تعلق ہی اُن کی تحقیقات کے نتائج کا اکثر بنگالی زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہی۔

میرے امکان سے خارج ہی کہ اس موقع پر ان عظیم الشان ادبی سرگرمیوں کا عشر عشیر بھی بیان کر سکوں جو ہماری زبان کی ترقی میں نظر آتی ہیں۔ کتابیں مطبعوں سے اس کثرت سے نکلتی چلی آ رہی ہیں جیسے برسات میں حشرات الارض اور جو سیاسی ریولیشن، ہماری ہمارے ملک میں تقریباً دس سال سے رونما ہی اس نے علم ادب کے ایک ایسے شعبہ کو ترقی دی ہی جو علاوہ اپنی اندرونی خوبیوں کے مختلف النوع بھی ہی اور زبان جو اظہارِ خیالات کے لیئے آلہ کا کام دیتی ہی درجۂ کمال کی طرف اس قدر تیزی سے قدم بڑھا رہی ہی کہ بعض ایسی کتابیں جو چند سال پیشتر اپنی لطافتِ بیان سے اہتزازِ روح کا باعث ہوا کرتی تھیں اب سکّۂ رائج الوقت نہیں سمجھی جاتیں۔ بابو سرت چندر بنرجی کے بعض ناول اس قدر اعلیٰ پایہ کے ہیں کہ دنیا کے موجودہ افسانہ نگاروں کے بہتر سے بہتر تصنیف سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ضمناً یہ امر بھی قابلِ ذکر ہی کہ بابو صاحب موصوف کو گزشتہ سال اپنی تصانیف کی فروخت سے اُنیس ہزار روپیہ کی آمدنی ہوئی حالانکہ اُن کی کتابیں مدرسوں اور کالجوں میں نہیں پڑھائی جاتیں۔ اُن سے ادنی درجہ پر اور بے شمار مصنف ہیں جنہیں وہّابِ ازل کی بارگاہ سے بہت کچھ صحیح مذاق نظم و نثر کا عطا ہوا ہی۔ غرض کہ ہمارے علم ادب کے ہر شعبہ میں ایک ایسی زندگی اور سرگرمی کے آثار نظر آتے ہیں کہ معمولی چند روزہ مسافر بھی اُن سے متعجب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۳۔ ترقیاتِ زمانۂ حال

سر آشوتوش مکرجی نے حال ہی میں اس طرف توجہ کی ہی اور ہندوستانی زبانوں کو ایم۔ اے کے امتحانوں میں داخل کیا ہی۔ ذیل میں اس نصابِ تعلیم کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہی جو ہماری یونیورسٹی نے بی اے کے بعد والے درجوں کے لیے مقرر کیا ہی۔ ہر اُمیدوار کو ایک زبان بطور مضمون خاص کے لینی لازمی ہی۔ اِس کے علاوہ اور زبانیں ذیلی

ہیں جن میں سے ایک یعنی ضروری ہے۔ اِن زبانوں کے نام یہ ہیں - بنگلہ، ہندی، اُردو، اوڑیا، گجراتی، میتھلی، ملایالم، مرہٹی، تلنگی، کنڑی، تامل، سنہالی، آسامی اور کنڑی - علاوہ بریں ہر طالب علم کو پالی، فارسی اور پراکرت میں سے جو نئی زبانوں کے ماخذ ہیں دو زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں - نیز اُس پر لازم ہوگا کہ اُصول السنہ کے مُطابق ہند کی آریائی زبانوں پر ایک مضمون تیار کرے نیز اس کے مُطالعہ کا ایک موضوع یہ بھی قرار دے کہ وہ اُن اثرات پر بحث کرے جو مغربی علم ادب سے اُس کی خاص زبان پر پڑے ہیں -

اِس خاص زبان کے متعلق ایم اے کے طالب علم کو تاریخ ادب اور کتبہائے نصاب قدیم و جدید مع اُصولِ صرف و نحو و عروض، المختصر ہر شے کا جو اس سے متعلق ہی اچھی طرح مُطالعہ کرنا ہوگا - دوسری زبانیں جو بطور ذیلی یا اُصولی زبان کے مطالعہ کی جائینگی ان کا صرف ابتدائی علم کافی سمجھا جائیگا - دو سال ہوئے کہ حسب ذیل انتظامات تمام صوبہ جات مختلفہ کی زبانوں کے علم ادب سے نصابی انتخابات تیار کرنے کے لیے کئے گئے تھے -

مرہٹی - پروفیسر ڈی - آر - بھنڈارکر ایم - اے (جنھیں عنقریب پی - ایچ - ڈی کی ڈگری ملنے والی ہی) جو قدیم ہندوستانی تاریخ و تمدن کے کارمائیکل پروفیسر ہیں -

پراکرت :- ڈاکٹر پی ڈی گون - ایم اے - پی ایچ ڈی زیر ہدایات سر رام کرشن بھنڈارکر ایم اے کی سی آئی ای -

آسامی :- جناب ہیم چندر گوسوامی مصنف "ہیماکوش" لغت زبان آسامی -

اُردو :- آنریبل ڈاکٹر عبداللہ سہروردی ایم اے - پی ایچ - ڈی -

پالی :- مہامہو پدھیا ڈاکٹر ستیش چندر ودیا بھوشن ایم اے پی ایچ ڈی اور ڈاکٹر بینی مادھب برنا ایم اے ڈاکٹر آف لٹریچر (لندن) -

اوڑیا :- مسٹر پی سی موجمدار بی اے -

گجراتی :- پروفیسر آئی جے ایس تاراپوروالا بی اے - پی ایچ ڈی (لندن) اور پروفیسر ڈھرووا ایم - اے - ایل ایل بی -

ہندی :- لالہ سیتارام بی اے -

چونکہ مذکورۂ بالا زبانوں میں سے بعض کے انتخابات ہمارے پاس موجود ہیں اور نیز علمی پروفیسریاں قایم کرنے کے لیئے باہر سے سرمایہ بھی وافی آگیا ہی اس لیئے اب ہم نے علاوہ بنگلہ کے "خاص زبانوں" کی فہرست میں تین زبانیں اور داخل کردی ہیں یعنی میتھلی - ہندی اور اوڑیا - تیرہ ذیلی زبانوں میں سے ہر ایک کے لیئے ؎ ماہانہ کا ایک وظیفہ مقرر ہی جو دو سال تک ملیگا - یہ ایک ایسی کوشش ہی کہ شاید ہر ایک زبان کے لیئے کوئی نہ کوئی طالب علم ہر سال مل ہی جائیگا -

سر آشوتوش کا خیال ہی کہ دس برس کی مدت میں کم سے کم دو سو بنگالی ایسے تیار ہو سکینگے جنھیں ہندوستان کی مختلف زبانوں کا خاصا علم حاصل ہو جائیگا - تحقیقات تاریخی کے نقطۂ نظر سے یہ بہت بڑا کام ہوگا اس لیئے کہ اہل ہند کی تاریخ کا جس قدر سرمایہ ہی وہ سب ہندوستانی زبانوں کے خزانہ میں مدفون پڑا ہی اور مستشرقین نے ابھی تک اسے کھود کر باہر نکالنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی - جیسے جیسے ہندوستانی زبانوں سے ہمیں واقفیت زیادہ ہوتی جائیگی ہمیں اس قسم کے موقعے ملتے جائینگے کہ تاریخ ہند کے ایسے واقعات جو ابھی تک کسی کے علم میں نہیں ہیں صفحہ قرطاس پر لائیں اور تاریخ ہندوستان کی عمارت کو جدید بنیادوں پر قائم کریں - سر آشوتوش نے اس وقت تک چار عالموں کو اس تحقیقات کے کام پر مقرر کیا ہی یہ سب ہندی زبانوں کے ایم اے ہیں - مقصود یہ ہی کہ وہ دیسی زبان کے علم ادب کا کامل مُطالعہ کرکے تاریخ ہندوستان کے غیر معلوم واقعات کو معلوم کریں ان میں سے بعض نے اپنی تحقیقات کے جو نتائج پیش کیئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہی کہ جو توقع اُن کی ذات سے وابستہ تھی اس سے زیادہ اُنھوں نے کام کر دکھلایا ہی - اس کام کا جو نتیجہ ہوگا وہ گویا ہمارے سامنے تمام اقوام ہند کے اتحاد کی مجسّم تصویر ہوگا - اِس تصویر میں ہندو مسلمانوں کا اتحاد سب سے زیادہ نظر آئیگا اس لیئے کہ قدیم ملکی علم ادب کے مُطالعہ سے معلوم ہوتا ہی کہ ان دونوں قوموں میں یگانگتِ خیال - اتحادِ مقاصد و اشتراک تمنا اس حد تک موجود ہی کہ بلا خیالِ تردید یہ محسوس ہوتا ہی کہ ہم ایک متحدہ ہندوستان کی ہوا میں زندگی بسر کر رہے ہیں -

کلکتہ یونیورسٹی کے سینٹ نے یہ رزولیوشن بھی منظور کرلیا ہی کہ مدارس میں میٹرکیولیشن تک کی تعلیم ملکی زبان کی وساطت سے دی جایا کرے - مگر انگریزی بھی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے برابر پڑھائی جایا کریگی -

اُمید ہو کہ ہزاکسلنسی گورنر جو چانسلر ہیں اس رزولیوشن کو منظور فرمائینگے جس وقت کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی تمام سفارشوں پر عمل ہو جائیگا اور اُمید ہو کہ بہت جلد ایسا ہونے والا ہو تو کالج کی تعلیم بھی ہماری زبان ہی میں دی جایا کریگی۔ ہم نے اتنا تو کردیا ہو کہ منطق کا ایک رسالہ جو بنگلہ میں لکھا گیا ہو ایف اے نصاب میں داخل ہوگیا ہو اور تاریخ کی حد تک بھی یہ رعایت رکھی گئی ہو اگر طالب علم چاہے تو بنگلہ میں تاریخ کی کتابیں موجود ہیں انھیں پڑھ کر امتحان کی تیاری کرسکتا ہو اپنی زبان میں انشاپردازی یہ ایک ایسا مضمون ہو جو ۱۹۱۹ء سے یونیورسٹی کے امتحانات بی اے۔ ایف اے اور میٹرک میں برابر لازمی چلا آرہا ہو۔ اب ہمارے لیئے جو کوشش کرنے کی چیز ہو وہ یہ ہو کہ تمام مضامین کی تعلیم ملکی زبان ہی کے واسطے سے دی جائے۔ اِس جدید روش کو اختیار کرنے کے لیئے راستہ اب بالکل صاف نظر آتا ہو۔

بنگال میں لوگ خواہ مرد ہوں یا عورت تعلیم میں اس قدر ترقی کرچکے ہیں اور کم سے کم متوسط طبقے میں یہاں وہ حالت کہیں نہیں جیسی کہ میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اپنی کنووکیشن Convocation کی تقریر میں اہل ہند کی نسبت بیان کی تھی کہ اس ملک میں ایک ہی گھر کے لوگوں میں ایک شخص تو اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ ہو اور دوسرا شخص جاہل اور کندۂ ناتراش۔ بنگالے میں اس قسم کا تباین کہیں نظر نہیں آتا۔ یہاں صحیح معلومات کی اشاعت پُرمغز کتابوں اور پرچوں کی مدد سے ہنیں ہورہی بلکہ بنگالی ماہواری رسالے جن کے مطالعہ کی سب سے زیادہ شوقین عورتیں ہوتی ہیں اشاعتِ علوم کا نہایت عمدہ ذریعہ بن گئے ہیں۔ ہمارے یہاں کے گریجوئٹوں کی تعداد کم وبیش تیس ہزار مندرجہ فہرست ہو ان میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہو جنھوں نے گزشتہ بیس سال میں سندیں حاصل کی ہیں۔ گریجوائیٹ عورتوں کی تعداد بھی ہمارے یہاں اچھی خاصی ہو۔ تمام دیگر ہندوستانی صوبجات کے مقابلہ میں اس صوبہ میں اعلیٰ تعلیم بہت زیادہ پھیل گئی ہو۔ یہ گریجوایٹ عام طور پر بنگالی زبان کی بہترین انشاپرداز ہیں بنگالی عورتوں نے بھی بہت سی کتابیں اپنی زبان میں لکھی ہیں اور آج کل بھی چار پانچ ایسی گریجوائیٹ عورتیں موجود ہیں جن کے نام بنگالی مصنفین میں بلند پایہ رکھتے ہیں۔

علمی تحقیقات کا کام اور قدیم قلمی نسخوں کی قدر و قیمت

جو کامیابی کہ تعلیمی معاملات میں ہم نے حاصل کرلی ہے اور جس کا یہ مختصر حریہ تھا، اس سے ناظرین پر واضح ہوگا کہ ہماری ادبیات میں ایک ایسا زمانہ بھی گزرا ہے جب کہ ادبی اور علمی کتابوں کے ترجمے انگریزی زبان سے بنگالی زبان میں باقاعدہ طور پر کیئے جاتے تھے۔ اور اس فصل میں ہم نے بہت کچھ خرمن جمع کیا تھا۔ لیکن اب جا کر کہیں ہماری آنکھیں اپنی طریقہ تعلیم کے ایک عیب پر کھلی ہیں۔ ہم نے سارا زمانہ یورپ کے علم ادب اور یورپ کی تاریخ کے پڑھانے میں کاٹا اور خود اپنے ادب و تاریخ پر بہت ہی کم وقت و توجہ صرف کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی ہم کو خود اپنی قومی تہذیب و تمدن کی معرفت حاصل نہیں ہونے پائی تھی جو بنیاد کو پختہ کرتی کہ ہم مغربی قوموں کے وضع و انداز کی نقل کرنے لگے۔ ہم انقلاب فرانس کی تاریخ سے تو واقفیت رکھتے ہیں لیکن فتوحاتِ اسلامی کی قبل و بعد کی تاریخ ہند کا کافی علم نہیں ہے ہمیں برطانوی پارلیمنٹ کے عروج و ترقی کا علم تو حاصل ہے لیکن ہم میں سے کتنے ایسے ہونگے جنھیں یہ خبر ہوگی کہ ہمارے ملک کی دیہاتی جماعتیں اور پنچایتیں کیونکر پیدا ہوئیں کیسے بڑھیں اور مخلوط قوم کے مابین ان دیہی جماعتوں نے کیا رشتہ قائم کیا؟ ہمیں کویکروں[1] (Quakers) کی تحریکوں اور کیتھولک مذہبی پیشواؤں حتیٰ کہ آرتھر و گلیا کی کہانیاں تک اچھی طرح یاد ہیں۔ لیکن ہم میں سے کتنے لوگوں نے پیروں فقیروں اور سادھوؤں کے مختلف طریقوں اور سلسلوں کے حالات معلوم کرنے کی پروا کی ہے جو درحقیقت مخلوق پر مغل بادشاہوں سے کہیں زیادہ حقیقی معنی میں حکمرانی کرتے تھے۔ ہمارے گریجوایٹ جب تعلیم کے میدان میں آگے قدم بڑھاتے ہیں تو ان کے نصاب میں ان مذہبی اور معاشرتی تحریکات کا کہیں پتہ نہیں چلتا جنھوں نے ہندو مسلمانوں کے خیالات کو باہم سمو دیا۔ اور دونوں کو شیر و شکر کر کے اتحاد و اتفاق کے ڈگر پر ڈال دیا تھا۔ ایسے تمام معلومات کے نظارے زمانہ قدیم کے ملکی علم ادب کے خزانوں میں جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں موجود ہیں کہیں کہیں ادہر ادہر منتشر سے دکھائی دیتے ہیں۔ جو گیت اور ترانے کہ آج تک قصبات و مواضع میں گائے جاتے ہیں باوجود اپنے ظاہری بھدے لباس کے بیش بہا تاریخی حقائق سے معمور ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ دنیائے حال کی ترقی کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہیں اور اپنی آئندہ تاریخی عمارت کی تعمیر میں سبق لیتے رہیں۔ لیکن

---

[1] عیسائی مذہب کا ایک فرقہ

یہ ایک مہمل سی بات ہوگی کہ ہم ممالک غیر کی سیمیا کی سی نمود سے چکا چوندھ میں آجائیں اور اندھوں کی طرح اس کی ہو بہو تقلید شروع کردیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قوم پر جس نے ہزاروں سال اپنی جداگانہ تہذیب کی ترتیب و تعمیر میں صرف کردیئے ہیں یہ غیر ملکی نمایش تہذیب مسلط نہیں کی جاسکتی۔

بنگال میں آج کل بہت کوشش ہو رہی ہے کہ اپنی سعی و تلاش سے خود اپنے گھروں سے ایسا تاریخی مواد پیدا کریں جو بلا واسطہ ہو۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی نے اس وقت تک سات ہزار پرانی بنگالی قلمی کتابیں جمع کرلی ہیں۔ ستہیا پرسات کلکتہ کے قبضے میں پانچ ہزار ایسے قلمی نسخے موجود ہیں۔ نج کے طور پر بھی بہت سے لوگ اسی کام میں مصروف ہیں اور نیز ستہیا پرسات کی شاخیں جوڑہا کہ راج شاہی۔ چاٹ گاؤں اور میمن سنگھ میں ہیں انھوں نے بھی ایسے نسخوں کی ایک کثیر تعداد جمع کرلی ہے۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ دیش بندھو چتیا رنجن داس نے کلکتہ کی ستہیا پرسات کو اپنا ذخیرہ کتب دے دیا ہے جس میں پندرہ سو بنگالی قلمی کتابوں کے نسخے ہیں۔ نیز یہ خبر ملی ہے کہ مولوی عبدالکریم چاٹ گامی بابو شب رتن مترا بیر بھومی اور مسٹر ناگندرا ناتھ کلکتوی کے کتب خانوں میں بھی ایسی قلمی کتابوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے۔ غالباً یہ نسخے چودھویں صدی اور اٹھارویں صدی عیسوی کے مابین نقل کیئے گئے ہیں ان میں ہر قسم کے مضمون پر ایک نہ ایک کتاب موجود ہے۔ مثلاً ڈاک اور کھانہ کی بنگالی کہاوتیں جو تقریباً ایک ہزار برس پہلے لکھی گئی ہیں بنگالہ کے کسانوں کے تجربات کاشتکاری کو خوب تفصیل سے بیان کرتی ہیں جو وہاں کی زمین کے لئے موزوں ہیں اس کے علاوہ برجستہ اور مشہور عوام کہاوتوں میں حسابات اور علم ہیئت کے نہایت صحیح اعداد بھی بیان کیئے گئے ہیں۔ بنگال کے مشہور ریاضی داں شوبھنکر نے جسے تین سو برس سے زیادہ زمانہ گزرا علم ہندسہ کے قواعد پر ایک ایسی ہی نظم چھوڑی ہے جس کی سادگی بیان پر اس وقت تک کوئی فوقیت نہیں لے جاسکا اور جس کے قاعدوں کی حسن و خوبی کے متعلق ریورنڈ ای لانگ صاحب فرماتے ہیں کہ "اس طرح ہندؤں نے ایک ایسے طریقۂ عمل میں ہماری رہنمائی کی ہے جو اب کہیں جا کر انگلستان میں بچوں کے مدرسوں میں رائج ہو چلا ہے" اس سلسلہ میں میں یہ بیان کردینا چاہتا ہوں کہ میرا روئے سخن اس وقت صرف ان کتابوں کے متعلق ہے جو بنگالی زبان میں لکھی گئی ہیں نہ کہ سنسکرت کے قلمی کتب کی طرف جنھیں جمع کرنے کا ذمہ بنگالے کی ایشیاٹک سوسائٹی نے اپنے سر لیا ہے۔

قدیم بنگالی قلمی کتابوں کی تلاش اور دھن میں میری نظر سے اکثر اردو اور فارسی قلمی کتب بھی گزری ہیں۔ لیکن

چونکہ میرے پاس زائد سرمایہ نہ تھا اور نہ میں ان زبانوں کی ناواقفیت کی وجہ سے اُن کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو سکتا تھا اس لیئے میں نے انھیں جمع نہیں کیا۔ نہیں معلوم ان میں کیا کیا خزانے پوشیدہ ہونگے۔ لیکن چوں کہ مسلمان خود ایسے ہیں جنھیں اپنے ہندو بھائیوں کے مقابلے میں علوم تاریخ کا بہتر شعور حاصل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان قلمی کتابوں میں ایسا بہت کم تاریخی مواد چھپا ہوا پائینگے جو اس وقت تک ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے اور اس سے دنیا ناواقف ہے۔ ہر سال بکثرت ایسی قلمی کتب آگ کیڑوں اور سیلابوں کے نذر ہوتی رہتی ہیں اور کوئی باضابطہ کوشش ایسی نہیں کی جا سکتی کہ انھیں محفوظ رکھا جا سکے۔ ہماری یونیورسٹی کے پاس ان کتابوں کو جمع کرنے کے لیئے کوئی سرمایہ نہیں ہے اور بنگال کے مسلمانوں نے بھی خود اپنی تاریخ میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی ہے۔ کچھ بنگال ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ تمام ہندوستان میں ہم لوگوں کی غفلت کی وجہ سے اسی طور پر بہ کثرت قلمی کتابیں ضائع ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ کیڑے سیلاب آگ اور بچّوں کی طفلانہ دست بردہی ان بیش قیمت اشیاء کے دشمن ہوں بلکہ جرمنی اور امریکہ کے سیّاح بھی قدیم ہندوستانی قلمی کتب کی تلاش میں تمام ملک میں چکّر لگاتے رہتے ہیں اور میں حتمی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ابھی حال ہی میں اُڑیسہ کے کسی مندر کے پانڈوں سے بہت سستے داموں خرید کر اُن کتابوں کے انبار اپنے ملکوں کو لے گئے ہیں۔ یورپ کے جتین کی ایک سوانح عمری تھی جو کسی اوڑیا شاعر نے چھ جلدوں میں ساڑھے تین سو برس ہوئے کہ تاڑ کے پتوں پر لکھی تھی میرے ایک دوست کے پاس سے ایک امریکن مسافر نے حال ہی میں بارہ سو روپیہ کو خرید لی مجھے افسوس ہے کہ ہمارے کانوں میں اس سودے کی بھنک تک نہ پڑی اور اب یہ کتاب بحر الکاہل کے پرے ایسے دُور دراز ملک میں پہنچ گئی ہے کہ واپسی کی کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ان باتوں پر اب آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ہم خود اپنے بزرگوں کی میراث کی پوری قدر نہیں کر سکتے تو خواہ مخواہ دوسرے لوگ اُن کتابوں کو جن کی کوئی یہاں پرواکرنے والا نہیں ہے لے جائینگے اور انھیں پڑھ پڑھ کر ہندوستان کے ایسے حالات لکھینگے جو ان ہی کتابوں سے ماخوذ ہونگی اور جن پر نظر ڈالنے میں ان مصنفین نے اپنے نقطۂ خیال سے کام لیا ہوگا۔

موجودہ زمانے میں صرف اسی کی شدید ضرورت نہیں ہے کہ ایک غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کا جو مصنوعی طریقہ جاری ہے اُسے منسوخ کیا جائے۔ بلکہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے کہ جس قدر قلمی کتابیں ہماری زبانوں میں ہیں

وہ سب برباد ہونے سے بچائی جائیں اور مختلف پہلوؤں سے بہ احتیاط تمام اُن کا مطالعہ کیا جائے۔ بہت سی ایسی کتابیں ملینگی جو ادبی حیثیت سے ادنی اور حقیر ہونگی۔ لیکن ممکن ہی کہ فلسفہ و تاریخ کی نظر سے قابلِ قدر ہوں جس سے قطع نظر کرنا ظلم ہوگا۔

حواشی

(متعلقہ مضمون نمبر ۱)

ایک زمانہ میں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ بنگالی زبان کی اصل سنسکرت سے ہی۔ مگر بالآخر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ زمانہ حال کے علمائے تاریخ السنہ کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہی کہ بنگالی زبان پراکرت سے پیدا ہوئی۔ سر جارج گریرسن جو اس زمانہ میں تاریخ السنۂ ہند کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں اُن کی یہ رائے ہی کہ بنگالی زبان اردھ مگدھی پراکرت سے پیدا ہوئی ہی۔ بعض علما یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی اصل دراوڑی ہی۔ بابو بجے چندر مزمدار نے ابھی حال میں ایک قابلِ تعریف کتاب تاریخ زبان بنگالی پر لکھی ہی اور اس میں یہی خیال ظاہر فرمایا ہی۔ اُنھوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں بہت سی مثالیں دی ہیں۔ جن میں دونوں زبانوں کے قدیم لاحقوں (Suffixes) اور تصریف کو دکھایا ہی اس میں شک نہیں کہ بنگالی زبان کی لغت میں بہت سے سنسکرت الفاظ شامل ہوگئے ہیں جو احیائے علوم کے زمانہ میں برہمنوں نے پندرھویں و سولھویں صدی کے مابین داخل کردیے تھے لیکن محض الفاظ و لغت پر قیاس کرکے کسی زبان کی اصل کا پتہ لگانا محققانہ اُصول نہیں کہا جائیگا۔ اس سے زیادہ صحیح اندازہ نحو اور زبان کی ساخت کی بنا پر کیا جاسکتا ہی۔

پس اگر یہ معیار صحیح سمجھا جائے تو یہ دعویٰ کہ سنسکرت سے بنگالی زبان کا آغاز ہوا ہے باطل ہو جاتا ہی۔

ڈاکٹر ای۔ ڈی۔ اینڈرسن (آئی۔ سی۔ ایس) آنجہانی پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے یہ بیان کیا ہے کہ بنگالی زبان تبتی و برمی زبان سے پیدا ہوئی ہی اور مسٹر راکھل راج رائے۔ ایم۔ اے۔ جنھیں کلکتہ یونیورسٹی نے

بنگالی زبان کی تاریخی تحقیقات کے لیئے مقرر فرمایا ہے اُن کی تحقیق یہ ہے کہ یہ زبان تبتی زبان سے ماخوذ ہے۔

غرضے کہ یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا ہے۔ پراکرت بولنے والی آریا قوموں کی اتنی مختلف شاخیں بُدھ مت کے عروج کے زمانے مگدھ دیش میں آباد ہو گئی تھیں کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ بنگالی زبان کی ابتدا اردھ مگدھی پراکرت سے ہوئی تب بھی یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ صرف یہی آخر الذکر زبان اُسے وجود میں لانے کا باعث ہوئی۔ پیشاچی پراکرت کا بھی اس میں حصّہ معلوم ہوتا ہے۔ ہماری زبان کے منہ میں بعض ایسے اجزا بھی ہیں جو ڈالکہ پراکرت کے مماثل نظر آتے ہیں۔ جو زبان دربار میں اور شرفا کی سوسائٹی میں بولی جاتی تھی۔ اس میں مسلمانوں کے آجانے سے ایک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ جو تحریریں انتظام مملکت کے متعلق ہوتی تھیں ان میں فارسی اور عربی الاصل الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔

جو الفاظ سنسکرت سے ماخوذ تھے اور مسلمانوں سے پہلے معاملاتِ سلطنت میں رائج تھے اُس کی جگہ فارسی اور عربی الاصل الفاظ آ گئے۔ مثلاً راجشو یا کر سنسکرت کے الفاظ مالگزاری یا لگان کے واسطے استعمال کیئے جاتے تھے۔ اس کی جگہ لفظ کھجنا[1] آ گیا۔ لفظ بھومی جس کے معنی زمین کے تھے اس کی جگہ جمی[2] ہو گیا۔ اور اسی طرح پرجا یعنی اسامی کی جگہ رعیت کا استعمال ہونے لگا۔ قانونی اور درباری زبان میں اسی طرح سیکڑوں فارسی کے الفاظ داخل ہو گئے۔ صرف انھیں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ ملک اب مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا ہے۔ طبقہ اعلیٰ اور اُمرا کی سوسائٹی میں تکلف کی چیزوں کے اسلامی نام رائج ہو گئے مثلاً عطر یا جھاڑ اور دیوالگیری وغیرہ وغیرہ جن کے معنی مختلف قسم کے چراغ دان ہیں۔ مکتب، علم وغیرہ الفاظ جن سے تعلیمی مدارس و تہذیب کا مفہوم لیا جاتا تھا بنگالی زبان میں عموماً بولے جانے لگے۔ اب ہزاروں فارسی کے الفاظ بنگالی زبان میں رائج ہیں اور اکثر دیگر الفاظ کے ساتھ جو سنسکرت سے ماخوذ ہیں روزمرہ بات چیت میں استعمال ہوتے ہیں۔ ملک کے علم ادب میں بھی ان کا بہت کچھ دخل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری زبان اور علم ادب دراصل ملک کی ملی جلی آبادی اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔

(۲) مسلمانوں کے آنے سے پہلے بنگالی زبان کے علم ادب میں گیت اور دوہے تھے مثلاً مینا ماترگان۔ گورکشن بجے۔ سورج گان

---

[1] غالباً خزانہ کا بگاڑ ہے۔ (اڈیٹر)

[2] یہ "زمین" کی خرابی ہے (اڈیٹر)

مناشار بھاشن ۔چنڈی منگل ۔ دہرم منگل اسی قسم نظمیں ہیں۔ اُن کے علاوہ چند کتابیں مذہبی رسوم پر تھیں مثلاً سونیا پوران اور دہرم پدہاتی مصنفہ رامائی پنڈت۔ اُن کے علاوہ گیت۔ بچن۔ اور کہاوتیں بھی تھیں جیسے کہ داکرا اور کھنار بچن۔ ان میں سے اکثر تصنیفیں اور بالخصوص منگل گان کو برہمنوں نے زمانۂ مابعد میں نئے سرے سے لکھا تھا۔ چونکہ ان شعرا نے جنھیں اعلیٰ ذکاوت و علم و فضل سے بہرہ وافی حاصل تھا دوبارہ ان نظموں کو لکھا تھا، اس لیئے قدیم شعرا رفتہ رفتہ زاویۂ گمنامی میں آتے گئے۔ مثلاً مانک رام کے دہرم منگل اور اس کے بعد گنارام کی تصنیف نے زمانہ قدیم کی نظموں کو جو مایور بھٹ نے لکھی تھیں گرد کر دیا اور کانا ہری دت کے مناشار بھاشن پر نظموں کے ضمیمے بجوی گپتا اور نارائن دیو نے پندرھویں صدی عیسوی میں اضافہ کیئے۔ نیز قدیم زمانے کے چنڈی کابیا کی شہرت میں مکندرام کی نظم چنڈی منگل سے جو سولھویں صدی میں لکھی گئی ہے گہن سا لگ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ قدیم کی یہ تصنیفات خام نظر آتی ہیں اور اُن کی زبان اور بعد کی سنسکرت آمیز زبان میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے۔ اُن کی طرز ادا بمقابلہ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کی تصنیفات کے زیادہ سادہ اور بے ساختہ معلوم ہوتی ہے۔ زمانۂ مابعد کی عالمانہ نظموں نے شعرا کو اس پر مجبور کیا کہ عروض سنسکرت کے قواعد و ضوابط کی پابندی ملحوظ رکھی جائے۔ آنکھوں کو کنول سے مشابہت دینا لبوں کو بمبا کے پھلوں سے ناک کو خوبصورت تل کے پھولوں سے تشبیہ دینی لازمی قرار پائی۔ عورت کی چال کو نزاکت اور شان کے لحاظ سے ہاتھی کی رفتار سے تشبیہ دینی پڑی۔ احیاے علوم بنگالہ (یعنی چودھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی تک) کے زمانہ میں یہ استعارے اور تشبیہات عموماً استعمال ہونے لگے۔ لیکن زمانۂ قدیم کی نظمیں دہقانی زندگی کی سادی دل فریبیوں سے مملو نظر آتی ہیں۔ اور سنسکرت کی نظموں سے کوئی شے ماخوذ نہیں پائی جاتی۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے کی جو کہانیاں ہیں ان میں ایک خوبصورت عورت کی تصویر جو پڑی سو رہی ہے، اس طرح کھینچی گئی ہے کہ " وہ اپنے پلنگ پر سو رہی ہے، اُس کا لباس ڈھیلا ڈھالا ہے، اس کے کالے کالے بال تمام بستر پر بھرپور کھلے پڑے ہیں "۔ اس میں کوئی تشبیہ نہیں ہے مگر جو تصویر کہ کھینچی گئی ہے وہ باوجود استعارات سے عاری ہونے کے کامل نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کے آ جانے کے بعد برہمن اور دیوتا سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ درحقیقت زمانہ مابعد کی جس قدر نظمیں ہیں سب اِنھیں دو کی تعریفوں سے مملو نظر آتی ہیں۔

لیکن مسلمانوں کے آنے سے قبل جب کہ بدھ مت کا دور دورہ تھا اس زمانے کی نظموں کے طرز بیان میں بہت سادگی پائی جاتی تھی۔ کنچن مالا کی کہانی میں ایک عاشق اس سادہ طریقہ پر قسمیں کھاتا ہے "میں دھرتی کی قسم کھاتا ہوں کیونکہ یہ متبرک شے ہے اور اس میں پھول اُگا کرتے ہیں" پھول لطافت و شرافت کی علامت ہیں اور زمین جس میں پیدا ہوتے ہیں متبرک سمجھی جاتی ہے۔ زمانہ مابعد میں اگر وہ قسم کھاتا تو ضرور برہمنوں اور دیوتاؤں کی قسم کھاتا۔ گورکشا وجے جو قبل زمانہ احیائے علوم کی ایک نظم ہے گو اس کی زبان کچّی ہے لیکن اس کے سننے یا پڑھنے سے بزرگ جوگی کی اعلیٰ اخلاقی لہجہ اور ترکِ دنیا کی تلقین کا اثر پڑتا ہے۔ آپ کو زمانۂ احیار کی شیریں اور رواں بنگالی زبان میں تلاش کرنے پر بھی گورکشا کی مانند شریف و بزرگ شخصیت کہیں نظر نہ آئیگی۔ زمانہ مابعد میں اخلاقی برتری اور شریفانہ افعال کے جذبات و نازک خیالی کو ہمیشہ ترجیح دی گئی ہے۔

(۳) اسلام کا اثر اس میں صاف نظر آتا ہے کہ بجائے براہمہ قدیم کے پنتھ کے جس میں سرشٹی (کائنات) کو برہم مانتے ہیں صرف ایک خدا کی پرستش میں ترقی ہونے لگی۔ منسا کی پوجا نیز چنڈی اور کرشن کی پوجا میں اسلامی توحید کی طرف میلان صاف نظر آتا ہے۔ شیو کی پوجا کی وجہ سے جو قدما میں رائج تھی طریقۂ ہمہ اوست کی شکل پیدا ہو گئی تھی۔ شیو دیوتا صفات سے معرا، بے پروا، اپنی ہی عظمت پر قانع اور تمام دنیاوی رنج و راحت سے بالاتر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب مسلمان ہاتھ میں قرآن پاک لے کر آئے اور ایک زندہ مذہب کی قوت کو ظاہر کیا اور جب کبھی انھیں مدد کی ضرورت ہوتی اپنے خدا سے دعا کرتے اور یقین رکھتے کہ اُن کا خدا ہمیشہ اُن کے ساتھ ہے اور ان تمام جنگوں اور لڑائیوں میں اُن کا شریک ہے جو حق کے لیئے لڑی جاتی ہیں تو شیو کی موہوم عظمت اپنی جگہ قایم نہ رہ سکی۔ شیو پنتھیوں کا خیالی مذہب اس وقت تک اپنی خیالی عظمت کے تصور میں کہ "میں وہ ہوں" مگن رہا۔ لیکن عوام کو ایسے خدا کی ضرورت تھی جس کی شخصیت معلوم ہو موہوم نہ ہو اور جس سے وہ اپنی دنیاوی کشمکش پریشانیوں اور خطرات میں مدد طلب کر سکیں۔ سب سے زیادہ اس ضرورت کا احساس اس وقت ہوا جب کہ مسلمان فاتحوں نے یہ بتایا کہ وہ اپنے خدا سے دعا کرتے ہیں اور خدائے بزرگ و برتر اپنے بندوں کی حاجتوں کے وقت ہمیشہ اپنا فضل و کرم نازل فرمانے کے لیئے آمادہ رہتا ہے۔

غرض کہ ان اسباب کی وجہ سے شیو پنتھ کو زوال شروع ہوا اور اُس کی جگہ کرشن دیوتا۔ منسا دیبی۔ چنڈی

اور دیگر معبودوں کی عبادت شروع ہوئی، جو اپنی عبادت کرنے والوں کی فلاح و بہبود میں بہت تردد اور ذاتی دل چسپی کا اظہار کرتے تھے۔ اگر شیو پنتھ اپنی تمام صفات کے ساتھ اب بھی باقی رہتا تو یقیناً بنگالہ کے تمام ہندو مسلمان ہوگئے ہوتے۔ لیکن بعد کے مذہبوں نے مذہب اسلام سے کچھ کچھ عقائد لے کر اپنے میں ملائے اور اس ضرورت کو پورا کردیا جو اہلِ اسلام کے جوش و خروش کی تقلید میں ملک میں پیدا ہوگئی تھی۔ ان نو واردوں کا اثر قدیم بنگالی علم ادب پر ایسا وسیع ہوا کہ تمام رنگ ہی بدل گیا۔

(۴) ہندو راجہ اور ان کے درباری برہمن بنگالی سے جسے وہ گنواری زبان کہتے تھے نفرت کرتے تھے۔ ایک سنسکرت کا اشلوک ہے کہ اگر شاستروں کا ترجمہ بنگلہ میں ہوجائے تو جو کوئی اس ترجمہ کو پڑھیگا وہ سیدھا جہنم کے درجۂ اسفل میں داخل ہوگا۔ اگر بنگال میں ہندو راجہ حکمراں رہتے تو بنگالی زبان کو سلطنت کی طرف سے سرپرستی کی مطلق کوئی اُمید نہیں ہوسکتی تھی۔ اس ترقی کے زمانے میں بھی جب کہ تمام یورپ رابندرا ناتھ کی نظموں کی تعریفوں سے گونج رہا ہے۔ ایسے برہمن موجود ہیں (یعنی مذکورۂ بالا اشلوک کے لکھنے والے ہزار سالہ قدیم برہمنوں کی اولاد) جو اب بھی بنگالی زبان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

جب کہ مسلمانوں نے اس ملک پر قبضہ کیا اور اپنی حکومت قائم کی تو مسلمان نوابوں نے ملک کے درمیان دہقانیوں کے ساتھ سکونت اختیار کی۔ قدرتی طور پر ان کی یہ خواہش ہوئی کہ ہندوؤں کے مذہب اور شاعری کے متعلق واقفیت حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن سنسکرت کی صرف و نحو کی تحصیل بارہ برس سے کم میں نہیں ہوسکتی تھی۔ جس کے بغیر سنسکرت کی کتب مقدس کو سمجھنا ناممکن تھا۔ اس لئے ان مسلمان اُمرا نے جو ملک میں بس گئے تھے اور وہاں کی زبان بولتے تھے۔ ہندو پنڈتوں کو مقرر کیا کہ سنسکرت کی نظموں قدیم رزم بزم کی داستانوں اور کتب مقدس کے ترجمے بنگالی زبان میں کریں۔ چنانچہ ناصر شاہ نے چودھویں صدی عیسوی میں حکم دیا کہ قدیم داستان مہابھارت کا ترجمہ بنگالی زبان میں کیا جائے حسین شاہ کے مشہور سپہ سالار فضل خاں نے بھی ایک شاعر کبندرا پرمیشور کو حکم دیا کہ مذکورۂ بالا داستان کا ترجمہ بنگلہ میں کرے۔ یہ ترجمہ بہت جامع اور بہتر ہے اور اب تک مسودہ کی شکل میں موجود ہے اور سرمایۂ ہونگی

وجہ سے چھپ نہ سکا۔ یہ ترجمہ پندرھویں صدی کے شروع میں کیا گیا تھا۔ شری کرن نندی ایک دوسرا شاعر تھا جو اس کے چند سال بعد مشرقی بنگالہ میں نواکھلی کے ایک مسلمان امیر چھوٹے خاں کی طرف سے اس کام پر مقرر ہوا تھا کہ جیمن کے اسوامیدہ پروا کا ترجمہ بنگالی زبان میں کرے۔ پندرھویں صدی کے اوائل میں بھاگبت[1] کا ترجمہ مالادھر باسو نے کیا جسے اپنے سرپرست مسلمان بادشاہ سلطانِ گور کی طرف سے گن راج خاں کا خطاب ملا۔ صرف یہی چند مثالیں نہیں بلکہ اس قسم کی بیشمار مثالیں موجود ہیں۔ علاال شاعر نے ہندی نظم پدمات کا ترجمہ بنگالی نظم میں ردنگ (برما) کے ایک مسلمان سردار مگن ٹھاکر کے حکم سے سترھویں صدی عیسوی میں کیا۔ جب کہ مسلمان شاہنشاہوں نے ابتدا کی اور اپنی مثال سے علمی سرپرستی اور قدردانی کا اظہار کیا تو دیگر والیان ملک اور ماتحت راجاؤں نے بھی باوجود متعصب ہمنوں کی مخالفت کے ایسی مثالوں کی تقلید کے بغیر چارہ نہ دیکھا۔ غرض کہ اس طرح قدیم بنگالی علم ادب کو خوب ترقی ہوئی اور مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں اُسے بیحد عروج حاصل ہوا۔

(۵) جو تعلیمی ترقی بنگالی زبان نے انگریزوں کے آنے سے پہلے ادبی اور مذہبی شعبوں میں کی تھی وہ ایسی عظیم الشان تھی کہ اس گزشتہ سو سال میں کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جو باوجود اس تمام تحسین و آفرین کے جو زمانہ جدید کی تصنیفات کے متعلق ہو رہی ہے حقیقی شاعری اور دقیق جذبات روحانی کے اظہار میں وشنوی نظموں اور ہماری گھریلو کہانیوں کے ہم پلہ تصور کی جا سکے۔ گزشتہ زمانے میں واقعی ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے دنیاوی منافع کو جذبات روحانی پر تصدق کر دیا کرتے تھے اور شعرا اُن کی فیض صحبت سے مستفید ہوتے تھے۔ گویا وہ لوگ اپنے گرد و پیش کے ایسے حالات میں زندگی بسر کرتے تھے جسے حقیقی شاعری اور جذبات سے بھرے ہوئے سکھ اور چین کی زندگی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ زمانۂ حال کا علم ادب زیادہ تر تقلیدی ہے اور اکثر و بیشتر بدیسی رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ علاوہ بریں بیان کے لحاظ سے پر از الفاظ اور نوعیت کے لحاظ سے جدت سے عاری ہے۔ ایسے شعرا جیسے کہ ترتیو اس اور چندی داس تھے جنھیں پانسو سال ہوتے آتے ہیں اور مکند رام اور گوبند داس جو سولھویں صدی میں گزری ہیں اب بھی

---

[1] یعنی بھاگبت پران جس میں سری کرشن جی کے حالات و سوانح درج ہیں (اڈیٹر)

ان کا کلام بکثرت پڑھا جاتا ہے اور باوجود اس کے کہ اتنی صدیاں گزر گئی ہیں پھر بھی عوام کے مذاق میں اُن کے ساتھ وہی دلچسپی اور لذت باقی ہے۔ یہی صفت اگر ہم اپنے زمانۂ حال کے شعرا کی طرف منسوب کرنا چاہیں تو ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ایشور گپتا اُنیسویں صدی کے شروع میں سب میں افضل تھا مگر اب اس کی نظمیں بہت کم پڑھی جاتی ہیں۔ نثر لکھنے والوں کو لیجئے تو پچاس برس پہلے اکشئے دت اور ودیا ساگر کی تصانیف ہر کوئی پڑھتا تھا لیکن اب وہ فرسودہ نظر آتی ہیں۔ حتیٰ کہ بنکم چندر کا سا نامور انشا پرداز جو ابھی ہیں پچیس سال ہوئے ہمارے علم ادب کا سب سے زیادہ تاباں ستارہ نظر آتا تھا بہت کچھ دھندھلے میں آگیا ہے۔ اور اس زمانہ کے پڑھنے والے کو اس میں وہ گرمی اور فراوانی جذبات نہیں ملتی۔ جو ہم اپنے کالج کے زمانہ میں اس کی تصنیفات میں پایا کرتے تھے۔ وجہ یہ ہے جس نور کے ساتھ ان کی چمک تھی وہ اپنا نہیں تھا بلکہ دوسروں سے عاریتاً لیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے اُن کا عروج گو کتنا ہی شاندار نظر آتا تھا مگر جلد غروب ہو جانے کا پیش خیمہ تھا۔ لیکن یہ میری رائے تذبذب سے خالی نہیں ہے۔ اصل فیصلہ زمانہ کے ہاتھ میں ہے اور میں یا مجھ سے بڑھ کر نقادانِ سخن اس وقت کوئی قطعی رائے قایم نہیں کر سکتے۔ زمانہ جس قدر گزرتا جائیگا اُسی قدر زیادہ ان شعرا کے کمال کے متعلق صحیح رائے قایم کرنے کا موقع ملے گا۔

(۶) بنگالی علم ادب پر انگریزی زبان کا بیحد اثر ہوا ہے۔ شروع زمانہ میں جب کہ ٹٹوا بدھنی پتریکا بنگالہ کی تعلیم یافتہ جماعت کے مذاق کی رہنمونی کرتا تھا اس کے بہت سے مقالات میں اُن خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے جو کبھی ریمبلر Rembler[1] اور اسپکٹیٹر (Spectator) میں شائع ہوتے تھے۔ مائیکل مادھو سودھن کا اخیر باب جس میں تپال (Pluto) دیش کو بیان کیا ہے ورجل[2] کی اینڈ کا لفظی ترجمہ ہے جس میں ڈانٹے[3] کے ادبی خزانہ سے بھی کہیں کہیں مستعار لیا گیا ہے۔ سر والٹر[4] اسکاٹ کے ناولوں نے بنکم چندر کے افسانوں پر بہت اثر ڈالا ہے اور گو یا بنگالی ناول نگار آئیونہو (Ivanho) کے مطالعہ کا انکار کرتا ہے تاہم اس کا ناول ائیشا بظاہر اس کی نقل

---

[1] انگریزی کے دو مشہور ادبی رسالے جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں لندن سے شائع ہوتے تھے (اڈیٹر)
[2] رُوما کا مشہور شاعر جو ۷۰ سال قبل مسیح پیدا ہوا اور سنہ ۱۹ء میں انتقال کر گیا (اڈیٹر)
[3] اٹلی کا مشہور آفاق شاعر جو تیرھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے (اڈیٹر)
[4] انگلستان کا مشہور شاعر اور ناول نویس۔ اس کے فسانے عموماً تاریخی ہوتے ہیں (اٹھارھویں صدی عیسوی) (اڈیٹر)

معلوم ہوتا ہے جسے اس نے درگیش نندنی سے پہلے تصنیف کیا تھا۔ مسٹر رومیش چندر دت آنجہانی کے تقریباً تمام ناول سر والٹر اسکاٹ کے طرز پر لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نوبین چندر "جنگ پلاسی" کے شاعر نے اپنی کتاب "سراج الدولہ کے خواب" میں شکسپیر کے جملے کے جملے تقریباً بہ لفظہ ترجمہ کر دیئے ہیں۔ بنکم چندر نے اپنے ناول بشیا برکشور (معاشرت ملک کا ایک افسانہ) کا پلاٹ اور نفس مضمون ایک مشہور فرانسیسی ناول سے اخذ کیا ہے۔ ہیم چندر اور نوبین چندر جو قدیم طریقہ کے دو بہت بڑے شاعر گزرے ہیں ان کی بہت سی نظمیں بائرن اور شیلی کی نظموں کو یاد دلاتی ہیں۔ ایسی خاص خاص مثالیں درج کرکے اس بحث پر ایک مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن اس مضمون کا میدان اتنا کشادہ نہیں ہے کہ زیادہ لکھا جائے۔ غرض کہ ہمارا جس قدر زمانۂ حال کا علم ادب ہے سب میں انگریزی سرایت کیے ہوئے ہے۔ سر رابندرناتھ ٹیگور کا جدید ترین ناول "گھاری بیری" Ghare Baire میں حریت نسواں کے مسائل پر بحث کی گئی ہے جن پر برنارڈ شا ابسن اور مارٹرلینگ قلم اٹھا چکے ہیں۔ ایک بات بہت دلچسپ ہے۔ وہ یہ کہ احیاء علوم کے ماقبل زمانہ میں بھی مسلمانوں کو بنگالی علم ادب سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ گورکشا وجے اور مینامتی گان انھیں کی توجہ کی بدولت محفوظ رہی ہیں۔ گورکشا وجے کا سب سے عمدہ نسخہ جو بنگال میں موجود ہے فیض اللہ چودھویں صدی کے ایک مسلمان شاعر کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور مینامتی میں بہت سے گیت دو تین صدی پہلے کے مسلمان مصنفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ دیہاتوں اور گاؤں میں اگر آپ جائیں تو مسلمانوں ہی کو خاص کر یہ گیت گاتے ہوئے پائیگا۔ میری نظر سے مناشار بھاشن کے بعض بہت قدیم نسخے گزرے ہیں جو مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ بہت سے مسلمان شاعروں نے سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں رادھا کرشن کے گیت لکھے ہیں۔ تین سو برس کا زمانہ ہوتا ہے کہ علااول (Allaol) نے جو ایک مسلمان شاعر تھا پدماوت لکھی جو ہماری قدیم بیش بہا عالمانہ نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ زمانۂ حال کے علم ادب میں بھی جو مستعدی مسلمانوں کی طرف ظاہر ہو رہی ہے وہ کچھ کم نہیں ہے۔ ہمارے مطابع میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابیں طبع ہو رہی ہیں جو قابل ستایش دلچسپی اور جوش کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور اکثر ایسی ہیں جو ادبی دنیا میں بلند مقام پر جگہ پانے کے قابل ہیں۔

سنسکرت کے عربی اور فارسی تراجم

یعنی

مسلمانوں کے ذوقِ علمی کی ایک دلچسپ تاریخ

از

جناب شیخ محمد اسمٰعیل سکرٹری اوریئنٹل پبلک لائبریری پانی پت

تمہید

مسلمانوں کا قدیم تمدن — گزشتہ اقوامِ عالم میں تہذیب و شائستگی اور اشاعتِ علوم و فنون کے لئے جیسا عہد مسلمانوں کا رہا ہے اُس کی مثال تاریخ قدیم میں کم ملتی ہے۔

۱ - سیاسی ترقی — حکومت کے لحاظ سے جو ترقی اُنھوں نے دنوں میں کی دوسری اقوام کو برسوں کیا صدیوں میں بھی نصیب نہیں ہوئی۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱ھ ۶۳۲ء) سے پہلے پہلے تمام عرب پر اسلامی قبضہ ہو چکا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۱۱ھ ۶۳۲ء تا ۱۳ھ ۶۳۴ء) کے عہد میں تمام عراق عرب۔ بصریٰ اور دمشق کے علاقے فتح ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کے عہد (۱۳ھ ۶۳۴ء تا ۲۳ھ ۶۴۴ء) میں طبریہ۔ فلسطین۔ عسقلان۔ بعلبک۔ حمص۔ حلب قیصریہ۔ قنسرین۔ انطاکیہ اور بیت المقدس پر اسلامی جھنڈا لہرانے لگا۔ ملک شام جس میں رومی سات سو برس سے حکمراں تھے سات برس کے اندر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ حضرت عمرؓ کی افواج قاہرہ نے بہت جلد ایران کو فتح کر لیا اور ایران کی شاہنشاہیت جس نے قدامت کی قسم کھا رکھی تھی صرف دو مہینے میں عربوں کی ہاتھ آ گئی۔ مغرب میں مصر کا علاقہ اور نوبہ کا ملک دونوں فتح ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ (۲۳ھ ۶۴۴ء تا ۳۵ھ ۶۵۶ء) کے عہد میں شمالی افریقہ کے بہت سے

علاقے خلیفۂ اسلام کے زیرنگین ہوگئے۔ گنجہ۔ بروعہ۔ شروان۔ خراسان۔ طوس۔ ہرات۔ نیشاپور۔ کرمان۔ سیستان۔ بیلقان۔ طالقان۔ فاریاب اور سرخس کے علاقے فتح ہوئے۔ اسلامی سپہ سالار ایران کا پورا ملک فتح کرکے قفقاز تک فوج لے گئے اور پھر ہندوستان تک جا پہنچے۔ ۴۴ھ میں کابل فتح ہوا۔ مغرب کی جانب ساحلِ بربر سے گزر کر ٹیونس فتح کیا اور آگے بڑھکر شہر کاریھج پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ حضرت معاویہؓ (۴۱ھ تا ۶۰ھ) کے زمانہ میں شمالی افریقہ کے تمام علاقے فتح ہوگئے۔ بارہ سو جہازوں نے بحیرہ روم کا دورہ کرکے تمام سمندری جزائر پر قبضہ کرنے کے بعد صقلیہ (جزیرہ سسلی) کو فتح کیا۔ قسطنطینہ پر متواتر حملے کئے اور دریائے جیحوں کے پار ہوکر سمرقند پر جا ڈیرا جمایا۔ حضرت معاویہؓ کے بعد خلفائے بنو امیہ نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا اور ایشیا میں سرحد چین تک اور یورپ میں بحر اوقیانوس تک پہنچے۔ ۹۳ھ میں آبنائے جبل طارق کو عبور کیا اور عیسائی قوم گاتھ سے سپین کا تمام علاقہ چھین لیا۔

غرض حضور رسول کریم صلعم کی وفات سے سو ہی برس بعد اسلامی سلطنت نے وہ وسعت حاصل کر لی جو تاریخ عالم میں نہایت حیرت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ یہ حکومت اُس وقت کوہ پرنیز (حد فاصل سپین و فرانس) و جبل طارق سے ہندوستان (دریائے سندھ) تک اور سواحل بحیرہ روم سے افریقہ کے ریگستانِ اعظم تک پہنچتی تھی۔ ایشیا کا بہت بڑا حصہ۔ عربستان سے ترکستان تک اور کشمیر سے خلیج فارس تک خلفائے اسلام کے ماتحت تھا۔ ایران فتح ہو چکا تھا بادشاہ کابل اور رئیس سندھ کے کل رئیس اسلام کے خراج گزار تھے۔ یورپ میں سپین کا علاقہ۔ جزائر بحیرہ روم اور سسلی پر اسلامی قبضہ تھا۔ افریقہ میں مصر۔ بربر۔ مراکش۔ ٹیونس۔ طرابلس اور نوبہ کے تمام ممالک مسلمانوں کی حکومت میں داخل ہوچکے تھے اور ان تمام ممالک پر اسلامی پھریرا اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ غرض اُس وقت کی معلومہ دنیا کے اکثر حصے اور تمام مشہور ممالک پر مسلمانوں ہی کا قبضہ تھا۔ یقیناً تاریخ مشکل سے کوئی ایک قوم مسلمانوں کے مقابلہ میں ایسی پیش نہیں کرسکیگی جس نے اتنے قلیل عرصہ اور صرف ایک صدی میں اتنے کثیر اور بے شمار بلاد و ممالک کو فتح کرلیا ہو۔

ب۔ علمی ترقی علوم و فنون کی طرف جس شوق اور انہماک کے ساتھ اُنہوں نے توجہ کی اور علم کے اس میدان میں جس بے تعصبی اور عالی حوصلگی کے ساتھ اُنہوں نے قدم رکھا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ جہاں سے جو علمی اور کام کی بات ملی اُنْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ کے ماتحت وہ اُن کی ملکیت تھی۔ چنانچہ مختلف بلاد اسلامیہ میں ہر قسم کے علوم کے سیکڑوں

ماہر اور مشاہیر موجود تھے۔

علمی ترقی کی تقسیم

علوم و فنون کی اشاعت کے طریقے مندرجۂ ذیل تھے۔

(۱) سلطنت کی جانب سے ترویج علوم کے مختلف محکمے قائم تھے۔ صیغۂ تراجم باقاعدہ طور سے موجود تھا جس میں لائق مترجمین اور ماہر زبان علماء سے لاطینی۔ عبرانی۔ سریانی۔ کالدانی۔ نبطی۔ قبطی۔ یونانی۔ فارسی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں کی چیدہ اور نایاب کتابوں کا ترجمہ کرایا جاتا تھا جس کے معاوضہ میں اُن کو بیش قرار تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

(۲) سلطنت کی سرپرستی کے علاوہ اکثر شائقِ علم اُمراء معقول تنخواہوں پر مترجمین کو ملازم رکھتے اور اُن سے اپنے شوق کی کتابیں ترجمہ کراتے تھے۔

(۳) علمائے مصر خود اپنے شوق سے بھی اکثر ہر قسم کی کتابوں کے ترجمے کرتے رہتے تھے۔

غرض سلطنت کی حمایت۔ امراء کے شوق اور علماء کے ذوق نے مل کر ہر قسم کے علوم و فنون کا ایک بہت بڑا ذخیرہ عربی میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ممالک اسلامیہ کے ہر ایک شہر میں علوم کے سمندر لہریں مار رہے تھے۔

یورپ کی موجودہ ترقی کی اصل

بلا شائبۂ شک یورپ کی موجودہ ترقی کے اصل اصول یہی ترجمے تھے۔ مولانا حالی مرحوم اپنے مسدس میں کتنی سچی بات کہتے ہیں ؎

وہ قومیں جو ہیں آج سرتاج سب کی
کنوڈی رہیں گی ہمیشہ عرب کی

یہی ترجمے تھے جن کی وجہ سے آج دنیا میں افلاطون۔ بقراط۔ سقراط اور بطلیموس وغیرہ یونانی حکماء کی تصنیفات موجود ہیں ورنہ اُن کے ناموں کا جاننے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ چہ جائیکہ اُن کی تصانیف سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے ان حکماء کے ناموں کو زندہ کیا اور زندہ رکھا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں　　وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
ارسطو کی تعلیم۔ سولن کے قانوں　　پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں
یہیں آکے مہرِ سکوت اُن کی ٹوٹی　　اسی باغِ رعنا سے بُو اُن کی پھوٹی

یہ تھا علم پر داں توجہ کا عالم | کہ ہو جیسے مجروح جویائے مرہم
کسی طرح پیاس اُن کی ہوتی نہ تھی کم | بجھاتا تھا آگ اُن کی باراں نہ شبنم

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا | فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا | مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا

کیا برطرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگایا زمانہ کو خوابِ گراں سے

سنسکرت تراجم اور مسلمان

ترقیاتِ علمی کی یہ دلچسپ تاریخ بہت سے حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ لیکن فی الحال ہم قارئین کرام کو صرف یہ بتائیں گے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد علمی میں ہندوستان کے علمی خزائن سے کس قدر فائدہ اُٹھایا۔ سنسکرت لٹریچر سے کس قدر اعتناء کیا اور اُس کی کون کون سی کتابوں کو عربی اور فارسی کا جامہ پہنایا۔ یہ ایک نیا اور دلچسپ مضمون ہے جو مفصل طور سے پہلی مرتبہ اُردو میں آیا ہے۔

سنسکرت تراجم پر مولانا شبلی کا مضمون

اس سے پہلے چند سال ہوئے صرف مولانا شبلی مرحوم نے اپنی کتاب " تراجم " میں دوسری زبانوں کی ذیل میں سنسکرت کے تراجم کی مختصر اور سرسری سی تاریخ بیان کی ہے۔

شبلی مضمون کو مکمل کیوں نہ لکھ سکے

شاید مولانا مرحوم اسے کچھ مفصل بیان کر سکتے مگر سنسکرت کتب کے ناموں کی صحت اور تلفظ الفاظ سے گھبرا کر اس فقرہ پر اپنے مضمون کو ختم کر دیا کہ " مبہم اور غیر صحیح التلفظ نام لکھتے لکھتے میں عاجز آگیا ہوں "

اس موضوع پر ہمارا مضمون

شاید مذکورۂ بالا دقت ہی کے باعث اس موضوع پر اب تک کوئی مستقل اور مفصل مضمون نہیں لکھا گیا مگر الحمد للہ عرصہ کی تلاش و جستجو اور بہت سی کتب و رسائل کے انتخاب و اقتباس کے بعد آج ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ سنسکرت کے عربی اور فارسی تراجم پر ایک مبسوط مضمون ہدیہ ناظرین کر سکیں۔ غالباً

آردو میں اس موضوع پر یہ سب سے پہلا مفصل مضمون ہے۔ جس کی ایک ایک سطر بہت سے مطالعہ اور ایک ایک فقرہ بڑی تلاش کا نتیجہ ہے۔

قبل اس کے کہ اصل مضمون کو شروع کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کتب اور رسائل کی یہاں ایک فہرست لکھدی جائے جن کی مدد سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مضمون ہذا ترتیب دیا گیا ہے۔ اس فہرست سے ناظرین اُس محنت کا کچھ اندازہ لگا سکیں گے جو مضمون کو اتنی کتابوں سے انتخاب و اقتباس کرکے مرتب کرنے میں پیش آئی ہوگی۔

فہرست کتب جن سے اس مضمون میں امداد لی گئی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		۱۔ کتب اردو	
۱	رسائل شبلی	شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم	مولانا کے ۱۱ تاریخی اسلامی مضامین کا مجموعہ ہے جو نہایت تحقیق سے مرتب کئے گئے ہیں
۲	مقالاتِ شبلی	ایضاً	اس میں بعد کے تیرہ مضامین جمع کئے گئے ہیں
۳	بیانِ خسرو	ایضاً	حضرت امیر خسرو دہلویؒ کی مختصر سوانح عمری ہے جس میں اُن کے کلام پر تنقید کی گئی ہے
۴	شعر العجم	ایضاً	فارسی شاعری کی تاریخ، شعرائے عجم کا مفصل تذکرہ اور اُن کے کلام پر ریویو پانچ جلدوں میں
۵	تذکرہ ابوریحان بیرونی	منشی محمد عنایت اللہ بی۔اے	بیرونی کی مختصر سوانح عمری ہے
۶	تاریخ ہند حصہ اول	ای مارسڈن و لالہ جیارام	ہندوستان کی مختصر باتصویر تاریخ دو حصوں میں ہے
۷	البرامکہ	منشی محمد عبدالرزاق کانپوری	خاندان برامکہ کی مفصل اور مشرح تاریخ تین یکجائی حصوں میں ہے۔ نہایت تحقیق اور تلاش کے ساتھ مرتب کی گئی ہے طرز بیان، شستگیِ زبان اور ترتیب مضامین کے لحاظ سے قابل قدر ہے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۸	مختصر تاریخ ہند	تھبرج صاحب	
۹	تاریخ التمدن الاسلامی جلد سوم	جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال مصر	مسلمانوں کی علمی ترقیات کی مفصل تاریخ ہے۔ مولانا محمد اسلم جیراجپوری نے علوم عرب کے نام سے اس کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا
۱۰	طوطا کہانی	سید حیدر بخش حیدری	معمولی کہانیوں کی کتاب ہے
۱۱	نوشیرواں نامہ	منشی دیبی پرشاد مورخ راجپوتانہ	نوشیروانِ عادل کی مفصل سوانح عمری ہے
۱۲-۱۳	بستانِ حکمت	مترجمہ فقیر محمد خاں گویا	مشہور کتاب انوار سہیلی کا ترجمہ ہے۔ اس کے دو نسخوں سے مدد لی گئی ہے ایک ۱۸۹۱ء کا مطبوعہ ہے دوسرا ۱۹۱۴ء کا
۱۴	مشرح سشرت حصہ اول	مترجمہ پنڈت ٹھاکر دت شرما	سنسکرت کی مشہور کتاب سشرت سنگھتا کے چار حصوں میں سے پہلے حصے کا ترجمہ مع تشریح ہے
۱۵	چرک	شائع کردہ آیور ویدک فارمیسو ٹیکل کمپنی لمیٹڈ لاہو	انھیں ناموں کی سنسکرت کتابوں کا ترجمہ ہیں
۱۶	سشرت		
۱۷	سنسکرت علم ادب	محمد شفیع الدین خاں مرادآبادی	اس میں سنسکرت کی مختلف تصانیف کی مختصر کیفیت بیان کی گئی ہے
۱۸	مختصر تاریخ اسلام جلد اول	ماسٹر ذاکر حسین	شروع سے اب تک کے تمام شاہانِ اسلام اور ممالک اسلامیہ کی نہایت جامع لیکن مختصر تاریخ ہے
۱۹	تاریخ کلیلہ و دمنہ	شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی	کتاب کے دوسرے ملکوں میں جانے اور اس کے مختلف تراجم کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۰	ہندو انسائیکلوپیڈیا	پادری پی کیول سنگھ	بے نظیر اور جامع کتاب ہے افسوس ہے کہ پانچ حصوں تک چھپ کر رہ گئی
۲۱	ہندوؤں کی تاریخ	وشنو	اس میں سنسکرت کی قدیم تصانیف کا تذکرہ اور ہندو تہذیب و شائستگی کا بیان بہت محنت سے مرتب کرکے لکھا ہے
۲۲	دربار اکبری	مولوی محمد حسین آزاد	اس میں عہد اکبری کی تصویر دلنشیں پیرایہ اور دلچسپ عبارت میں کھینچی گئی ہے دربار کے تمام باکمالوں کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں
۲۳	تاریخ الاطباء	شمس الاطباء ڈاکٹر غلام جیلانی	ہر مذہب و ملت کے ۴۶۶ قدیم اطبا۔ وید اور ڈاکٹروں کا تذکرہ نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ شروع میں علم طب کی مختصر تاریخ بیان کی ہے
۲۴	البیرونی	مسٹر سید حسن برنی بی۔اے	اس میں بیرونی کی مفصل سوانح عمری اور اس کی کتابوں پر مکمل تنقید درج ہے۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی ہے
۲۵	گلشن ہند	میرزا علی لطف	شعراء کا قدیم تذکرہ ہے۔ مولانا شبلی نے تصحیح اور ترمیم و تنسیخ کی اور مولوی عبدالحق بی اے نے زبان اردو کی تاریخ کے متعلق ایک زبردست مقدمہ کا اس پر اضافہ کیا
۲۶	مختصر تاریخ آرین علم طب	مترجمہ لالہ رام کرشن	سر بھگونت سنگھ کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ ہے
۲۷	فرہنگ آصفیہ جلد اول	منشی سید احمد دہلوی مرحوم	اردو زبان کی مکمل۔ مفصل اور ضخیم لغت چار جلدوں میں ہے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۸	تاریخ ہندوستان جلد ہفتم	شمس العلماء مولانا ذکاءاللہ	ہندوستان کے عہد اسلامیہ کی مبسوط تاریخ دس جلدوں میں ہے
۲۹	سنگھاسن بتیسی	مترجمہ سری لالو جی	مہاراجہ بکرماجیت کے حال میں ۳۲ کہانیوں کا مجموعہ ہے
۳۰	اُردو انوار سہیلی	مترجمہ عمر علی خاں وحشتی	انوار سہیلی فارسی کا ترجمہ ہے
۳۱	شرح انوار سہیلی	مولوی مرزا جان دہلوی	مختصر کتاب ہے

ب۔ کتب عربی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۳۲	کتاب الفہرست	ابن الندیم	ہر علم و فن کے متعلق عربی کتب کی ایک مکمل فہرست اور بڑی مشہور و معروف اور مفید کتاب ہے۔ اس کو اسلامی تصنیفات کی انسائیکلوپیڈیا کہیں تو بجا ہے ۳۷۷ھ میں تالیف کی گئی اور بہت سے حواشی اور ایک کامل انڈکس کے ساتھ گسٹو فلوگل نے اس کو لیپزک میں ۱۸۷۱ء میں شائع کیا
۳۳	عیون الانباء فی طبقات الاطباء	ابن ابی اصیبعہ	اطبائے قدیم کے حالات میں ایک نہایت بے نظیر اور جامع تصنیف ہے جو ۶۴۳ھ میں مرتب کی گئی
۳۴	مروج الذہب	مسعودی	ایک قدیم اسلامی تاریخ ہے جس میں بہت سا حصہ جغرافیہ کا بھی شامل ہے
۳۵	زہر الالباب	ابراہیم بن علی الحصری	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		ج۔ کتب فارسی	
۳۶	تاریخ فرشتہ	ابو القاسم فرشتہ	کل ہندوستان کی تاریخ ہے جس میں ۹۷۵ء سے ۱۶۰۵ء تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔
۳۷	غزلان الہند	مولوی غلام علی آزاد بلگرامی	ہندوستان کے علوم و فنون کا تذکرہ ہے۔
۳۸	تاریخ سیر المتاخرین	غلام حسین	
۳۹	مثنوی نہ سپہر	حضرت امیر خسرو	۷۱۸ھ کی تصنیف ہے۔ نو باب ہیں اور ہر باب ایک جداگانہ بحر میں ہے۔ اسی مناسبت سے نہ سپہر نام رکھا اور شاہ قطب الدین خلجی کے نام پر معنون کیا
۴۰	مآثر الامراء	نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں	مغلیہ عہد کے امرا کے حالات ہیں۔ بے مثل کتاب ہے۔
۴۱	خزینۃ المعارف جلد دوم	مفتی غلام سرور لاہوری	صوفیا اور صحابہ کے حالات کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے
۴۲	بہار دانش	منشی محمد عنایت اللہ لاہوری	عہد شاہجہاں میں انوار سہیلی کی طرز پر لکھی گئی۔
۴۳	تذکرۃ الشعراء	میر حسن مصنف بدر منیر	نایاب اور قدیم تذکرہ ہے۔
		د۔ کتب انگریزی	
۴۴	ہسٹری آف اُردو لٹریچر	پروفیسر گارسن ڈی ٹاسی	اُردو علم ادب کی مفصل تاریخ ہے۔
۴۵	انسائیکلوپیڈیا (بریٹینکا)	×	نہایت مشہور و معروف کتاب ہے
۴۶	فہرست کتب خانہ انڈیا آفس لندن	×	
۴۷	″ ″ برٹش میوزم لندن	×	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت

۵ - رسائل

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۴۸	مخزن لاہور	زیر اڈیٹری شیخ محمد عبدالقادر	ایک علمی ادبی پرچہ ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے جاری ہے اس کے متعدد مختلف نمبروں سے مدد لی گئی ہے
۴۹	ادیب الہ آباد	میر حسین عظیم آبادی	ادب اردو کا بے نظیر مصور رسالہ تھا۔ افسوس جولائی سنہ ۱۹۱۳ء سے بند ہو گیا۔
۵۰	محمدن انیگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ	×	اس میں کالج کی متعلقہ خبروں کے علاوہ علمی مضامین بھی ہوتے تھے اب بند ہے
۵۱	علی گڑھ منتھلی	×	" " " " اب اس کا نام علیگڑھ میگزین ہے
۵۲	آریہ مسافر میگزین جالندھر	لالہ منشی رام	اسلام کے خلاف مضامین کے لئے وقف تھا اب بند ہے
۵۳	الندوہ لکھنؤ	مولانا شبلی مرحوم	ندوۃ العلماء کا رسالہ ہے۔ علمی۔ اسلامی اور تاریخی مضامین شائع کرتا ہے۔ اس کے متعدد نمبروں سے مدد لی گئی ہے
۵۴	زمانہ کان پور	لالہ دیا نرائن نگم بی اے	ایک علمی۔ تاریخی اور ادبی پرچہ ہے

تمہید بیان کرنے اور فہرست کتب درج کرنے کے بعد اب ہم اصل مضمون کو شروع کرتے ہیں۔ اس میں عہد بعہد کی تاریخ علحدہ علحدہ اور ہر کتاب کی کیفیت جدا جدا تحریر کی جائیگی۔ اَلسَّعیُ مِنّی وَالاِتمَامُ مِنَ اللہِ تَعَالٰی

(سلسلۂ مضمون صفحہ سابق)

مسلمانوں میں ترویج و تراجم علوم کا دَورِ اول

خلفائے عباسیہ کی کوششیں

غیر زبانوں کے تراجم اور مختلف علوم و فنون کی اشاعت کے لحاظ سے اسلام میں خلفائے عباسیہ (۱۳۲ھ/۷۵۰ء تا ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) کا زمانہ خاص طور سے مشہور اور قابل ذکر ہے۔

۱۔ منصور عباسی کا عہد

ابو جعفر منصور (۱۳۶ھ/۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ/۷۷۵ء) خاندان عباسیہ میں پہلا بادشاہ ہے جس نے ترویج فنون اور اشاعت علوم پر خاص توجہ کی۔ اس نے ۱۴۳ھ/۷۶۰ء میں محکمۂ تراجم باقاعدہ طور سے قائم کیا جس کے ذریعے مختلف علوم و فنون اور متعدد زبانوں کی کتابیں عربی کے سانچے میں ڈھلنی شروع ہوئیں۔ منصور خود بھی بہت بڑا عالم اور صاحب فضل و کمال تھا۔ اُس کی حوصلہ افزائی نے علوم کا دریا بہا دیا اور غیر زبانوں کی سیکڑوں کتابوں کا اس کے زمانہ میں ترجمہ ہوا۔

ترقی علمی سے پیشتر کا زمانہ

اس وقت تک تمامی علوم و فنون۔ مذہبی مسائل۔ علمی خیالات اور تاریخی واقعات غرض سب کچھ زبانی بیان کیا جاتا تھا۔ مسائلِ مختلفہ کے محفوظ رکھنے اور باقاعدہ درس و تدریس کا کوئی انتظام نہ تھا۔

تدوینِ کتب

منصور عباسی ہی کے عہد کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسی کے وقت میں سب سے پہلے عربی علوم کی تدوین شروع ہوئی۔ چنانچہ حدیث۔ تفسیر۔ تاریخ۔ ہیئت۔ فلسفہ۔ طب اور ریاضی وغیرہ علوم کی کتابیں مدون کی گئیں اور لائق ترین اشخاص ترجمے کے کام پر مامور کئے گئے۔

ہندوستان کا علمی خزانہ آنا شروع ہوا

منصور کے ذوق علمی کا یہاں تک چرچا پھیلا کہ دور دراز ممالک سے مختلف اقوام کے

اہل کمال نے اُس کے دربار کا رخ کیا۔ چنانچہ ۱۵۶ھ میں ہندوستان کا ایک بڑا ریاضی داں ہندو عالم منصور کی علم پروری کا شہرہ سُن کر ہندوستان سے بغداد آیا اور سنسکرت کی ایک نہایت عمدہ زیچ "سدہانتا" نامی خلیفہ کے حضور میں پیش کی۔

۱۔ سدہانتا | اس کتاب کا مصنف ہندوستان کا ایک زبردست عالم برہم گپت نامی پنڈت تھا۔ مشرقی تاریخ علمی میں اس کتاب کا پایہ نہایت اعلیٰ ہے اور اس کتاب کو اس نے تیس سال کی محنت میں تیار کیا تھا[۱]۔ منصور نے اس کتاب کو شوق کے ہاتھوں سے لیا اور دربار کے مترجم اور مشہور مہندس محمد ابن ابراہیم فزاری کے سپرد کیا۔ تاکہ اس ہندو پنڈت کی مدد سے اس کا عربی میں ترجمہ کر دے[۲]۔

علم حساب میں اعداد کی علامات ہندوؤں کی ایجاد ہیں | یونانی و لاطینی میں اعداد و ارقام کی علامتیں درست نہ تھیں اور ٹھیک طور پر اُن کا کوئی قاعدہ منضبط تھا۔ زرا سا حساب کرتے تو اعداد کے لکھنے میں بہت سا وقت ضائع ہو جاتا۔ برہم گپت نے اس کتاب میں وہ علامتیں درج کیں جو ہندوستان میں مروج تھیں۔ مسلمانوں نے بھی عربی کتابوں میں یہی صورت اختیار کی اور پھر تقلیداً یورپ نے بھی یہی روش پسند کی اور کثرت مزاولت کی وجہ سے ساری دنیا میں "رقم عربی" کے نام سے یہ طریقہ مشہور ہو گیا۔ اہل یورپ اس کو اب تک عربوں کی ایجاد سمجھتے ہیں لیکن عربی کتابوں میں صاف طور پر ان علامات کا نام "ارقام ہندیہ" بتایا گیا ہے[۳]۔

سدھانتا کی عظمت | بطلیموس[۴] اور فیثاغورث[۵] کی کتابوں کی اشاعت سے پہلے تک اہل عرب میں یہی کتاب ہئیت کے درس میں داخل تھی۔ اب مفقود ہے۔

---

[۱] البیرونی ص ۱۳۱ [۲] البرامکہ ص ۶۶ اور رسائل شبلی ص ۳۶ [۳] الندوہ جلد ۲ نمبر ۵ ص ۱۵ [۴] بطلیموس یونان کا پہلا شخص ہے جس نے اصطرلاب بنایا اور آلات نجوم تیار کئے۔ اُس کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہارون الرشید کے عہد میں یحییٰ بن خالد برمکی کے زیر اہتمام بڑی شان سے ہوا تھا (رسائل شبلی ص ۳۱) [۵] فیثاغورث۔ یہ مشہور حکیم ۵۷۰ء اور ۵۰۶ء قبل مسیح کے درمیان گزرا ہے شاعری۔ موسیقی۔ حکمت۔ فلسفہ۔ ہندسہ۔ طبیعیات۔ ہئیت۔ جغرافیہ اور بہت سے علوم و فنون کا بے نظیر ماہر تھا علوم طبیعہ کے متعلق اس نے بہت سی نئی باتیں دریافت کیں۔ دنیا میں چل پھر کر جغرافیائی معلومات حاصل کیں زمین کے متحرک ہونے کا مسئلہ سب سے پہلے اسی نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور علم الارض کے متعلق بہت امور دریافت کئے اور ان علوم و فنون پر ۲۸۰ کے قریب کتابیں تصنیف کیں (تاریخ الاطباء ص ۶۴)

سدھانتا کا خلاصہ اس کتاب کے عربی ترجمے سے اخذ کرکے محمد بن ابراہیم فزاری نے کواکب میں ایک رسالہ مرتب کیا۔ ریاضی دانوں میں یہ رسالہ "سند ہند" کے نام سے مشہور ہے۔[۱]

۲- کرن کھنڈ کھانڈیک اس کے علاوہ برہم گپت کی کتاب "کرن کھنڈ کھانڈیک" کا بھی ترجمہ ہوا۔ جو عربی علم ادب میں "الارکند" کے نام سے شہرت رکھتی ہے۔[۲]

۳- ہتوپدیش یا کلیلہ و دمنہ

اب ہم اس معرکۃ الآرا اور شہرۂ آفاق کتاب کا تذکرہ کرتے ہیں جس سے ہندوستان اور یورپین دنیا کا بچہ بچہ واقف ہے یعنی "ہتوپدیش یا کلیلہ و دمنہ" دنیا کی مشہور ترین کتابوں میں سے یہ ایک کتاب ہے اور یورپ اور ایشیا کی بہت سی زبانوں میں اس کے بیسیوں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ہم نے نہایت تحقیق اور تلاش کے بعد اس عدیم النظیر اور بے مثل کتاب کی مفصل تاریخ اور اس کے متعدد مختلف تراجم کی مکمل کیفیت فراہم کی ہے۔ نہایت محنت اور جانکاہی سے اس کے مختلف تراجم کا ایک بے نظیر شجرہ مرتب کیا ہے اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس لاثانی کتاب کے متعلق اتنی تحقیق کم از کم اُردو زبان میں تو آج تک کی نہیں گئی۔ صرف یہی ایک بیان تمام مضمون کی جان اور میری بہترین کوشش کا پھل ہے جسے میں ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

کلیلہ و دمنہ کی تاریخ کتاب کلیلہ و دمنہ منصور کے حکم سے دربار کے میر منشی اور مشہور مترجم "عبداللہ بن المقفع" نے پہلوی زبان سے عربی میں ترجمہ کی۔ پہلوی میں یہ کتاب دربار نوشیروانی کے مشہور حکیم "برزویہ"[۳] نے سنسکرت سے ترجمہ کرکے اپنے آقا کے حضور میں پیش کی تھی۔ اب ہم شروع سے اس کی مسلسل تاریخ بیان کرتے ہیں۔

---

[۱] تاریخ التمدن الاسلامی جلد ۳ ص ۱۶۳ مصنفہ جرجی زیدان ڈیٹر رسالہ الہلال مصر [۲] البیرونی ص ۱۳۲ [۳] برزویہ اپنے زمانہ کا سربرآوردہ طبیب اور اس علم کا بڑا فاضل تھا۔ طب کے علاوہ حکمائے ایران و عقلائے ہند کے قدیم علوم پر بھی کامل عبور رکھتا تھا۔ اس نے ملک ہند کا سفر کیا اور وہاں کی مقدس علمی زبان حاصل کی۔ فیلسوفان ہند کی تصانیف کا غور سے مطالعہ کیا اور اُن سے کچھ فائدہ اُٹھایا (تاریخ الاطبا ص ۳۳۹)

۳۸۷۰

کلیلہ و دمنہ کی اصل کے متعلق مختلف روایات

سنسکرت میں یہ کتاب کس ہئیت اور کس نام کے ساتھ موجود تھی۔ اس کے متعلق مختلف روایات مشہور ہیں۔

۱۔ پہلی روایت

مشہور ترین قول یہ ہے کہ "ہتوپدیش" کے نام سے ایک مکمل کتاب سنسکرت میں موجود تھی جو مہاراجہ بکرماجیت اعظم (۳۷۵ء تا ۴۱۳ء) کے زمانہ میں تصنیف ہوئی تھی اور اسی کا "برزویہ" نے پہلوی میں ترجمہ کیا تھا۔

۲۔ دوسری روایت

ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب سکندر یونانی نے ۳۲۷ قبل مسیح میں ہندوستان کے راجہ پورس کو شکست دی تو تخت پر ایک اپنے سپہ سالار کو بٹھایا۔ اور واپس چلا گیا لیکن چند روز کے بعد رعایا نے بغاوت کی اور اس کو نکال باہر کیا۔ اور اس کی جگہ ایک شخص رائے داشلیم کو بادشاہ بنایا۔ رائے داشلیم نے کچھ دن تو عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی لیکن پھر رعایا پر سخت ظلم و تعدی کرنے لگا اور خلقت اس کی بیداد سے چلا اٹھی آخر کار ایک برہمن "بیدپا" نے راجہ کو نصیحت کرنے کا ارادہ کیا اور حضور میں حاضر ہو کر ملک کی سچی سچی کیفیت رعایا کی بے چینی اور خود راجہ کی بدکرداریاں نہایت صفائی کے ساتھ اس کے منہ پر بیان کر دیں۔ راجہ پہلے تو بہت ہی برافروختہ ہوا اور بیدپا کے قتل کا حکم دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس کے خون سے درگزرا اور قصور معاف کر کے حکم دیا کہ ایک کتاب فن ملک داری و سیاسیات میں ایسی تصنیف کر جس میں حکایات اور قصص کے ذریعے اخلاق و سیاست اور نظم و نسق سلطنت کی تعلیم دل نشین پیرایہ میں دی جائے۔ ایک سال کی مدت بیدپا کو اس تصنیف کے لئے دی گئی اور اس نے اس عرصہ میں کتاب "حکایات بیدپا و پل پا" ترتیب دیکر راجہ کے حضور میں پیش کی راجہ نے بہت پسند کی اور اس خوف سے کہ ایرانی اس کو اڑا نہ لے جائیں (کیونکہ مختلف اسباب کے باعث ان کی آمد و رفت ہندوستان میں زیادہ تھی) نہایت حفاظت کے ساتھ اسے کتب خانہ شاہی میں رکھوا دیا۔ بعد کے زمانہ میں اسی کو بدقت حاصل کر کے برزویہ نے پہلوی میں ترجمہ کر لیا۔"

مگر یہ محض ایک قصہ ہے جو اصلیت سے بالکل معرا ہے[۱]

۳۔ تیسری روایت

بعض کہتے ہیں کہ حکیم برزویہ جب ہندوستان میں آیا تو جو حکایات نصیحت آمیز و اخلاق آموز

---

[۱] بستان حکمت مطبوعہ جوہر ہند پریس ۱۸۹۱ء ص ۳ تاریخ کلیلہ و دمنہ مصنفہ شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی

یہاں زبان زدخاص وعام تھیں اُن کو جمع کرکے اور پہلوی میں لکھکر نوشیرواں کے حضور میں پیش کردیا۔

۴۔چوتھی روایت | ایک رائے یہ ہے کہ وہ کتاب جس کا برزویہ نے پہلوی میں ترجمہ کیا تھا ایک ضخیم کتاب "پنچ تنتر" نامی کا خلاصہ تھی اس کو بشن شرما ایک پنڈت نے تصنیف کیا تھا جو راجہ امرشکتی عرف شودرشن کے عہدحکومت میں جومہلا پورنگرمان کا فرمان روا تھا پیدا ہوا تھا[1]

اس روایت کی غلطی | یہ روایت قطعاً بے سروپا۔ بلاثبوت اور سراسر غلط ہے ایک سے زیادہ محققین نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔مولوی سید علی بلگرامی اپنی تصنیف تاریخ کلیلہ ودمنہ میں متذکرہ بالا روایت سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ جو کتاب ایران میں گئی اور جس کا ترجمہ ابن المقفع نے پہلوی سے عربی میں کیا وہ پنچ تنتر نہ تھی بلکہ وہ بڑا مجموعہ حکایات کا تھا جس کا بقیہ یہ پنچ تنتر ہے"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"سنسکرت میں اس وقت کوئی کتاب موجود نہیں جس کو کلیلہ ودمنہ کی اصل کہا جاسکے۔لیکن ایک کتاب پنچ تنتر البتہ ہے جس کے پانچ باب ہیں اور یہ پانچ باب کلیلہ ودمنہ کے پانچویں ساتویں۔آٹھویں۔نویں اور دسویں بابوں سے کم وبیش مطابقت رکھتے ہیں"

یعنی موصوف کے نزدیک اُس بڑی کتاب کا خلاصہ پنچ تنتر ہے[2]۔ نہ کہ پنچ تنتر کا خلاصہ کلیلہ ودمنہ ہے جیسا کہ

---

[1] ہندوؤں کی تاریخ مصنفہ وشنو ص۶۴

[2] **پنچ تنتر کی کیفیت** | جہاں تک مختلف کتب چھان بین سے پتہ لگ سکا وہ یہی ہے کہ پنچ تنتر بڑے مجموعہ حکایات "ہتوپدیش" کا خلاصہ ہے

وجہ تصنیف | اس کی تصنیف کا باعث لیتھبرج صاحب نے اپنی تاریخ ہند کے ص۴۴۹ پر یہ بیان کیا ہے کہ "ایک راجہ کے تین بیٹے تھے مگر تینوں حد درجہ کاہل۔نادان اور بڑے احمق واقع ہوئے تھے۔راجہ نے ایک روز اُن کے متعلق مشیروں سے مشورہ کیا تو ان میں سے بشن شرما نامی ایک عالم وفاضل برہمن نے راجہ سے کہا آپ خاطر جمع رکھیں میں اُن کا علاج کردونگا اور تینوں راج کنوروں کو اپنے گھر لے آیا۔اُن کو نہایت عمدہ تعلیم دی اور تربیت کی غرض سے یہ کتاب پنچ تنتر اُن کے لئے تصنیف کی"

کتاب کے ابواب کی تقسیم | اس کتاب کے پانچ حصوں کے نام حسب ذیل ہیں :۔

۱۔مترَبھید۔ یعنی دوستوں کا نفاق

۲۔متر پراپتی۔یعنی دوستوں کا پیدا کرنا

"ہندوؤں کی تاریخ" کے مصنف نے ظاہر کیا ہے۔

۵۔ پانچویں روایت | ماہر زبان سنسکرت شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی کی اس کتاب کے متعلق یہ رائے ہے کہ جس کتاب کا پہلوی میں ترجمہ ہوا اور عربی کے ذریعہ سے وہ تمام دنیا میں پھیلی وہ بدھ (۵۵۳ تا ۴۷۷ قبل مسیح) کی کتاب جاتک نامی ہے اور اس میں وہ حکایات درج ہیں جو بدھ نے اپنی گزشتہ زندگیوں کے متعلق وقتاً فوقتاً اپنے شاگردوں کو سنائیں۔ شمس العلماء فرماتے ہیں "یہ کتاب مع شرح کے ۲۵۰ قبل مسیح میں پالی میں (جو بدھوں کی مذہبی زبان ہے) مدون ہو چکی تھی اور اس وقت وہ جزیرہ سیلون میں (جو اس وقت تک ایک بہت بڑا مستقر بدھ مذہب کا ہے) گئی اور وہاں شرح کا ترجمہ سنگالی زبان میں ہوا۔ یہ سنگالی ترجمہ پانچویں صدی عیسوی میں دوبارہ پالی زبان میں منتقل کیا گیا۔"

خلاصۂ روایات | ان تمام روایات اور بیانات سے جو تحریر کئے گئے ہمارے لئے کم از کم یہ مان لینا ضروری ہے کہ سنسکرت میں آئین ملک داری و اصول اخلاق پر بے مثل کتاب ضرور موجود تھی اب خواہ اس کا نام کتاب جاتک رکھ لو یا ہتوپدیش۔ پنچ تنتر کہہ لو یا حکایات بید پا و بیل پا مگر جہاں تک ہم تحقیق کر سکے ہتوپدیش ہی وہ مشہور نام ہے جس کا پہلوی ترجمہ ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

۳۔ کاک اُلوکیہ۔ یعنی کوا اور اُلو جو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوتے ہیں
۴۔ سبدھ نشٹ۔ یعنی منفعت کا ضائع ہونا۔
۵۔ اَسَم پریکشا کرتو۔ یعنی بے دیکھے بھالے کام کرنا

موجودہ کتاب کے متعلق پروفیسر بن فائی کی رائے | پروفیسر بن فائی کی رائے ہے کہ "موجودہ کتاب پنچ تنتر پانچ بابوں میں نہ تھی بلکہ اس کے اصل میں کوئی تیرہ باب تھے اور اصل حکومت سے غرض اصول حکومت اور قواعد اخلاق کا تعلیم کرنا تھا اور نام بھی شاید اس کا "مراۃ الملوک" تھا جس سے یہ غرض صاف پیدا تھی آٹھ باب مفقود ہو جانے کے بعد اس کا نام پنچ تنتر (یعنی رشتہ پنجگانہ) رکھا گیا یہ باب کس زمانہ میں مفقود ہو گئے پتہ نہیں چلتا لیکن اس میں شک نہیں کہ جو کتاب ایران میں گئی اور جس کا عربی ترجمہ ابن المقفع نے کیا وہ پنچ تنتر نہ تھی بلکہ وہ بڑا مجموعہ حکایات کا تھا جس کا بقیہ یہ پنچ تنتر ہے۔" فقط

ہتوپدیش کے تراجم کی تاریخ

۱- اصل سنسکرت کے تراجم

۱- اصل سنسکرت کتاب کا سب سے پہلا ترجمہ

سنسکرت کی کتاب "ہتوپدیش" کا جس زبان میں سب سے پہلے ترجمہ ہوا وہ ملک ایران کی پہلوی زبان تھی۔ کیونکہ بہ نسبت دوسرے ممالک کے ایران اور ہندوستان کے درمیان تاجرانہ اور ملکی تعلقات زیادہ قائم تھے اور اس طرح سلسلۂ آمد و رفت جاری رہنے کے باعث ایرانی ہندوستان اور یہاں کے لٹریچر سے ایک حد تک بخوبی واقف تھے اور یہی واقفیت کتاب کے پہلوی ترجمہ کا باعث ہوئی۔

پہلوی ترجمہ کی کیفیت

پہلوی ترجمہ کس طرح ہوا؟ اس کی حکایت بڑی دلچسپ اور مزہ دار ہے:-

ایران کے مشہور شہنشاہ نوشیرواں عادل[۱] کے دربار کے فاضل حکیم اور ماہر السنۂ مختلفہ برزویہ نے ایک روز نوشیرواں کی خدمت میں عرض کی کہ "میں نے ہندوستان کی بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ اس ملک میں پہاڑوں پر ایک قسم کی چمکدار گھانس پیدا ہوتی ہے اُس کا خاصہ ہے کہ مردہ کے جسم سے مس کرنے سے وہ فوراً زندہ ہو جاتا ہے اگر حکم ہو تو ہندوستان جا کر اس اکسیر صفت گھانس کی تلاش کروں"۔ نوشیرواں نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور قنوج کے راجہ[۲] کے نام ایک خط اور تین سو اونٹ بطور تحفہ حوالے کر کے برزویہ کو رخصت کیا۔

برزویہ ایران سے قنوج پہنچا اور راجہ کی خدمت میں تحائف نذر گزرانے۔ خط پیش کیا اور اپنا مطلب بعنوان شائستہ بیان کر دیا۔ راجہ نے جواب دیا "مجھے کسی اس قسم کی گھانس کا پتا نہیں اور نہ آج تک اس کے متعلق میں نے

۱- نوشیرواں ایران کے شاہی خاندان ساسان کا بیسواں تاجدار اور نہایت عادل منصف رحیم اور زبردست بادشاہ تھا۔ اُس کے وقت میں سلطنت کو بہت وسعت حاصل ہوئی اور ایران کی ہیبت دور دور بیٹھ گئی۔ ۵۰۴ء میں پیدا ہوا اور ۵۳۱ء میں تخت نشین ہو کر ۵۷۹ء میں وفات پائی ۱۲

۲- راجہ کا نام اکثر کتب فارسیہ میں پرتاپ چند لکھا ہے مگر قنوج کے قدیم راجوں کے کتبہ جات سے راجہ پربھاکر نوشیرواں کا ہمعصر معلوم ہوتا ہے جس کا زمانہ کرنل کننگ ہام ۵۷۵ء سے ۶۰۰ء تک قائم کرتے ہیں۔

(ایشیاٹک سوسائٹی جرنل نمبر ۳ ۱۸۸۴ء - نوشیرواں نامہ ص ۳۰-۳۱)

کچھ سنا۔ البتہ آدمی تمھارے ساتھ کئے دیتا ہوں۔ کوہستان میں تلاش کرو۔ شاید گوہر مقصود پا جاؤ۔"

برزویہ نے پہاڑوں پر جاکر نباتات کا پتہ پتہ چھان مارا مگر مدعا حاصل نہ ہوا۔ مایوس ہو کر کہنے لگا کہ :۔
"ہندوستان کے لوگ عجیب مکار ہوتے ہیں۔ ایک محض غلط اور بے بنیاد بات لکھکر خواہ مخواہ مجھے اتنا پریشان اور دق کیا۔" ہمراہیوں نے کہا "آپ اتنے ناامید نہ ہوں۔ یہاں قریب ہی ایک نہایت معمر پنڈت اور عالم علوم قدیمہ رہتا ہے۔ اُس کے پاس چلئے اور اپنا مطلب بیان کیجئے۔ اغلب ہے کہ آپ کی مشکل آسان ہو۔" برزویہ اُس کے پاس گیا اور اپنی رام کہانی سُنائی بوڑھے پنڈت نے تبسم آمیز متانت کے ساتھ جواب دیا "تم نے ناحق جگہ جگہ کی خاک چھانی اتنا نہ سوچا کہ جس کا دم نکل چکا اُس کی روح واپس لانی انسانی طاقت سے باہر ہے۔ خدا مارے اور بندہ زندہ کردے تو خالق اور مخلوق میں امتیاز اور فرق کیا باقی رہا۔ دانایانِ ہند کا مطلب یہ نہیں تھا جو تم نے سمجھا۔ دراصل زبان میں لطیف استعارات فصاحت و بلاغت کی جان ہوا کرتے ہیں۔ ان کو بالکل ظاہر پر محمول کرلینا زبان کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ وہ عبارت جو کسی کتاب میں تمھاری نظر سے گزری اس میں پہاڑ سے مراد عقل ہے اور گھانس سے مراد عقل و دانش کی باتیں ہیں اور مردہ سے مقصود نادان کم عقل اور جہلا ہیں جن کے حق میں عقل مثل جان اور روح کے ہے۔ اور جاہل کو عقل اور نادان کو دانشمندی ایک کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جس کا نام "ہتوپدیش" ہے اور جو شاہی خزانہ میں حفاظت کے ساتھ رکھی ہوئی ہے۔

برزویہ کے سامنے اب تمام مسئلہ حل شدہ تھا وہ راجہ کے دربار میں واپس آیا اور اس نایاب کتاب کے دیکھنے کی آرزو ظاہر کی۔ راجہ نے کچھ تامل کے بعد شاہی خزانہ سے کتاب منگوائی اور برزویہ کے حوالے کی۔ برزویہ نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک ماہرِ زبان پنڈت کی مدد سے اُس کا پہلوی میں ترجمہ کرلیا۔ کتاب واپس کی۔ راجہ کا شکریہ ادا کیا اور ایران کو روانہ ہو گیا۔

دربار نوشیروانی میں پہنچ کر واقعہ بیان کیا اور کتاب حضور میں پیش کردی۔ نوشیرواں نے کتاب کے مطالب کو سُنا۔ بہت پسند آئی۔ برزویہ کو خاطر خواہ انعام دیا اور کتاب کو فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے وزیر السلطنت بزرجمہر کے حوالے کردیا۔ برزویہ نے درخواست کی میرا حسب نسب اور سوانح عمری بھی کتاب کے شروع میں درج کردیا جائے تو میرے نام کے بقائے دوام کی ایک صورت نکل آئیگی۔ درخواست

منظور ہوئی اور بزرجمہر نے پہلے باب میں اپنی طرف سے کچھ پند و نصائح اور دوسرے باب میں برزویہ کی سوانح عمری لکھ کر کتاب کے شروع میں لگادی اور اس طرح یہ پہلوی ترجمہ ۵۳۱ء میں اختتام کو پہنچا۔

قبل اس کے کہ پہلوی کے مشہور و معروف عربی ترجمہ کی کیفیت بیان کی جائے۔ یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اصل سنسکرت سے پہلوی کے علاوہ دو ترجمے اور بھی ہوئے ہیں:۔

۲۔ اصل کتاب کا دوسرا ترجمہ

ایک ترجمہ تبت کی زبان میں ہوا۔ جس وقت بدھ مذہب کی کتابیں تبت میں گئیں اُن میں یہ کتاب بھی تھی۔ یہ مذہبی کتب ملکی زبان میں ترجمہ ہوئیں تو ساتھ ہی اس کا بھی ترجمہ ہوا۔ پروفیسر شیفنر نے اس کو شائع کیا ہے[1]۔

۳۔ تیسرا ترجمہ

یہ تیسرا ترجمہ پروفیسر بن فائی المتوفی ۱۸۸۱ء نے جو ایک مشہور عالم تھے ۱۸۵۹ء میں بزبان جرمن دو جلدوں میں شائع کیا۔ پہلی جلد میں جو چھ سو صفحہ کی کتاب ہے۔ انہوں نے ہر ایک حکایت کے متعلق نہایت تفصیل سے تحقیقات کی ہے کہ وہ کہاں سے آئی؟ اور مختلف مجموعوں اور ترجموں میں اُس نے کونسی صورت پیدا کی؟ غرض ہر ایک مسئلہ پر جو اِن حکایات سے متعلق ہے نہایت شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی ہے اور ہر ایک نتیجہ کو بہ براہین و ادلّہ ثابت کیا ہے[2]۔

ب۔ پہلوی ترجمہ کے تراجم

۱۔ عربی ترجمے

پہلوی سے پہلا عربی ترجمہ

فارسی علم ادب کا جو خزانہ دار الخلافت بغداد میں آیا اس میں ہتوپدیش کا پہلوی ترجمہ بھی تھا کتاب کا شہرہ پہلے ہی سے بہت زیادہ تھا۔ خلیفہ وقت ابوجعفر منصور عباسی نے حکم دیا کہ اس

۱؎ تاریخ کلیلہ و دمنہ مصنفہ سید علی بلگرامی

۲؎ " " " " "

بے مثل کتاب کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا جائے۔ دربار کا میر منشی اور عربی و فارسی کا بے بدل ماہر عبداللہ بن المقفع[1] اس کے ترجمہ پر مامور ہوا۔ جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ کتاب کا ترجمہ کیا اور خلیفہ کے حضور میں پیش کر دیا۔

اس ترجمے کی عظمت

یہی ترجمہ کتاب کے بقا و قیام کا موجب ہوا ہے ورنہ آج اصل سنسکرت اور ترجمہ پہلوی دونوں مفقود ہیں اور ان حکایات کے متعدد ترجمے یورپ کی مختلف زبانوں میں اور ان کی اشاعت تقریباً تمام عالم میں اسی عربی ترجمے کے ذریعہ سے ہوئی ہے[2]۔ یہ عربی ترجمہ نہ کیا گیا ہوتا تو یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ آج دنیا کو اس بے مثل کتاب کے نام کا بھی علم نہ ہوتا۔ آئندہ چل کر ہم بتائیں گے کہ اس عربی سے کن کن زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے ہوئے اور پھر کس طرح اُن کی دنیا میں اشاعت ہوئی۔

ابن المقفع کے عربی ترجمہ کے مطبوعہ اڈیشن

ابن المقفع کی عربی تصنیف کو ڈی سالسی[3] نامی فرانس کے مشہور و معروف مستشرق نے سنہ ۱۸۱۶ء میں شاہی کتب خانہ پیرس کے چند نسخوں سے مقابلہ کر کے شائع کیا اور اس کے اول میں ایک طول طویل تقریظ اس کتاب کی اصل اور اس کے مختلف تراجم کی بابت فرانسیسی میں لکھی

---

[1] عبداللہ بن المقفع سنہ ۱۰۶ھ (۷۲۵ء) میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۳۹ھ (۷۵۶ء) میں مرگیا۔ اس کا باپ "دادویہ" نامی آتش پرست اور ولایت فارس کا عامل تھا۔ تغلب کی وجہ سے اس کا ہاتھ شکنجہ میں کسے جانے کی وجہ سے خشک ہوگیا جس کی وجہ سے اس کا نام المقفع پڑ گیا تھا۔ عبداللہ نے اپنے آبائی مذہب میں تعلیم پائی لیکن بچپن ہی میں مسلمان ہوگیا۔ عربی اور فارسی کا بے نظیر ماہر اور مسلم الثبوت اُستاد تھا۔ علمائے زبان عرب نے تسلیم کیا ہے کہ شروع اسلام سے آج تک عربی زبان کا ایسا فصیح و بلیغ مقرر اور زبردست صاحب قلم کوئی نہیں گزرا۔ اس کے ترجمے خاص طور سے عمدہ ہوا کرتے تھے۔ کلیلہ و دمنہ کے علاوہ یونانی اور فارسی زبان سے اس نے بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں (رسائل شبلی ص ۲۳۶۔ تاریخ کلیلہ و دمنہ)

[2] تاریخ کلیلہ و دمنہ

[3] بیرن ڈی سالسی سنہ ۱۷۵۸ء میں پیرس میں پیدا ہوا اور وہیں سنہ ۱۸۳۸ء میں وفات پائی۔ اکثر یورپین زبانوں کے علاوہ عبرانی۔ سریانی۔ کلدانی۔ سامری۔ عربی اور فارسی زبانوں کا ماہر تھا۔ مشرقیات میں یورپ میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی کوشش سے دو سو سے زیادہ مشرقی تصنیفات زیور طبع سے آراستہ ہوئیں (الندوہ ج ۸ نمبر ۸ بابت اگست سنہ ۱۹۱۱ء ص ۲۰-۲۱)

ڈی سالسی کا یہ نسخہ اُن کل نسخوں کا ماخذ ہی جو اس کے بعد شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے تین مصر میں چھپے۔ ایک دہلی میں شائع ہوا۔ ایک موصل میں چھپا اور ایک بیروت میں طبع ہوا۔

۱۸۷۳ء میں گیڈی ایک اٹالین عالم نے تین قدیم نسخوں سے ڈی سالسی کے نسخہ کا تکملہ چھاپا جس میں تین باب بڑھائے اور بعض موجودہ حکایات میں عبارت زیادہ کی۔

۲۔ پہلوی سے دوسرا عربی ترجمہ | یحیی برمکی کی فرمائش سے خلیفہ مہدی کے عہد میں عبداللہ بن ہلال اہوازی نے ۱۶۵ھ (۷۸۱ء) میں پہلوی سے عربی میں ایک ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کو اسی عہد میں وزیر مذکور کی فرمائش سے سہل نوبخت حکیم نے نظم کا جامہ پہنایا جس کے صلہ میں اُسے ایک ہزار دینار ملے۔

۳۔ تیسرا ترجمہ | تیسرا عربی ترجمہ جو پہلوی سے کیا گیا وہ خلیفہ مامون الرشید کے حکم سے سہل بن ہارون[۱] نے کیا تھا یہ بھی منظوم تھا۔

۴۔ چوتھا ترجمہ | چوتھا ترجمہ مرید اسود نے کیا جس کو خلیفہ متوکل نے خاص اسی کام کے لئے ایران سے بُلوایا تھا۔

۵۔ پانچواں ترجمہ | اسلم نامی بیت الحکمت کے ایک افسر نے بھی اس کا ترجمہ کیا۔

۲۔ سریانی ترجمہ

عربی تراجم کے علاوہ پہلوی سے ایک ترجمہ سریانی زبان میں بھی ہوا تھا جس کا نام "ترجمہ قدیم سریانی"[۲] رکھا گیا ہی۔ اس ترجمہ کا زمانہ تصنیف ۵۷۰ء کہا جاتا ہی۔ بود نامی ایک نسطوری پادری اس کا مترجم تھا۔ بعد کے زمانہ میں یہ کتاب ناپید ہوگئی مگر ۱۸۷۱ء میں اس کا ایک نسخہ نہایت عجیب و غریب طریقہ پر ماردین کی خانقاہ میں مل گیا۔ پروفیسر

---

[۱] سہل بن ہارون مجوسی المذہب عربی کا زبردست انشا پرداز۔ دربار مامونی کا مشہور مترجم اور بیت الحکمت کے لائق مہتمموں میں سے تھا۔ کلیلہ و دمنہ کی طرز پر اس نے ایک نئی کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام "ثعلہ و عفراء" تھا اس کے ہر باب و فصل میں کلیلہ و دمنہ کے ہر باب و فصل کا مقابلہ و معارضہ کیا گیا تھا (رسائل شبلی ص ۲۵ و علی گڑھ منتھلی جلد ۳ نمبر ۹ ص ۳۶۵)

[۲] اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ کلیلہ و دمنہ بار دیگر بھی سریانی میں ترجمہ ہوئی ہی جس کی کیفیت آئندہ بیان ہوگی

بن فائی نے ایک بہت بڑی تقریظ دو سو صفحے کی اس کے ساتھ شامل کی جو نہایت دلچسپ و پُر مغز ہے اور جس میں پختہ دلائل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ یہ سریانی ترجمہ عربی سے نہیں ہوا (ہم وہ دلائل لکھتے لیکن مضمون کی بے حد طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں) اس کو ۱۸۷۶ء میں پروفیسر بکل نے مع جرمن ترجمے کے شائع کیا۔

فی الواقع قدیم سُریانی ترجمہ اور ترجمہ عربی آپس میں بھائی بھائی ہیں یعنی دونوں کی ماں پہلوی ہے لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ سریانی بھائی بالکل لاولد اور عرصہ دراز تک گمنام رہا۔ برخلاف اس کے عربی بھائی کے بکثرت اولاد ہوئی اور اس کے بیٹے۔ پوتے اور پڑپوتے اس وقت تک نام آور تمام یورپ اور بہت بڑے حصہ ایشیا اور اُن کل قطاع عالم پر جہاں ان ملکوں کی زبانیں گئی ہیں قابض ہیں۔

ج۔ عربی ترجمہ کے تراجم

اب اُن تمام تراجم کی کیفیت تفصیل کے ساتھ بیان کی جاتی ہے جو ابن المقفع کے عربی ترجمے سے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئے :-

۱۔ عربی منظوم تراجم

بعض اشخاص نے اسی عہد میں ابن المقفع کے نثر ترجمہ کو نظم کے قالب میں بھی ڈھالا اُن کی تفصیل یہ ہے[۵۱]:-

۱۔ پہلا منظوم عربی ترجمہ	ایک ترجمہ ابان بن عبد الحمید رقاشی نے کیا۔
۲۔ دوسرا منظوم ترجمہ	دوسرا ترجمہ علی بن داؤد نے کیا۔
۳۔ تیسرا منظوم ترجمہ	تیسرا منظوم ترجمہ بشیر بن معتد نے کیا[۵۲]

---

۵۱ کتاب الفہرست ابن الندیم ص ۳۰۶ ۔ ۵۲ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۹۱

۲- فارسی تراجم

عربی سے فارسی کے ترجمے مندرجہ ذیل ہوئے ہیں :-

۱- پہلا فارسی ترجمہ | پہلے پہل سلطان ابوالحسن نصر بن احمد سامانی (۳۰۱ھ ۹۱۴ء تا ۳۳۱ھ ۹۴۲ء) کے حکم سے ابن المقفع کی عربی تصنیف نے فارسی کا لباس پہنا[1]۔ یہ ترجمہ نثر میں تھا۔

۲- دوسرا ترجمہ | پہلا ترجمہ نثر میں ہونے کی وجہ سے سلطان کو کچھ زیادہ مرغوب نہیں ہوا۔ دربار کے ملک الشعراء رودکی المتوفی ۳۴۰ھ سے فرمایا کہ عربی سے فارسی میں ایک منظوم ترجمہ کرو[2]۔ ترجمہ نظم ہوکر حضور میں پیش ہوا تو اس کے صلہ میں رودکی کو چالیس ہزار دینار مرحمت ہوئے[3]۔ چنانچہ عنصری ایک قصیدہ میں کہتا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش
عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

کلیلہ و دمنہ مترجمہ رودکی غالباً مثنوی ہوگی کیونکہ مسلسل واقعات مثنوی کے سوا کسی اور طرح ادا نہیں ہوسکتے[4]۔

۳- تیسرا ترجمہ | ۵۱۵ھ ۱۱۲۱ء میں ابوالمعالی نصراللہ بن عبدالحمید مستوفی نے بہرام شاہ ابن سلطان مسعود غزنوی (۵۱۲ھ ۱۱۱۸ء تا ۵۴۷ھ ۱۱۵۲ء) کے حکم سے ایک ترجمہ عربی سے فارسی میں کیا جو فارسی نسخہ کلیلہ و دمنہ کے نام سے مشہور ہے یہ وہی کتاب ہے۔

انوار سہیلی کی تصنیف

چونکہ کلیلہ و دمنہ میں عربی کے بہت سے اشعار اور بڑے بڑے دقیق و مغلق لغت بھرے ہوئے تھے لہٰذا سلطان حسین مرزا والی خراسان کے سپہ سالار امیر شیخ احمد سہیلی کی فرمائش سے مولانا کمال الدین حسین بن علی واعظ

---

[1] بستان حکمت ص ۵ [2] شعر العجم ج ۱ ص ۲۶ [3] شعر العجم ج ۱ ص ۲۹ [4] شعر العجم ج ۱ ص ۳۳

کاشفی سہروردی[1] نے اس کو فصاحت و بلاغت کے ساتھ آسان زبان میں اپنے طور پر ترتیب دیا اور امیر سہیلی کے نام پر معنون کر کے اُس کا نام انوار سہیلی رکھا۔

اگرچہ مولانا موصوف نے انوار سہیلی میں غیر مانوس الفاظ، مشکل محاورات، پیچیدہ ترکیبات سے حتی الامکان احتراز کیا ہے تاہم پندرہویں صدی کے اواخر کے عام رواج اور طرز تحریر کے موافق مرادف لفظوں مقفیٰ جملوں اور طویل ہم معنی فقرات کے میدان کو قلم کی جولانگاہ ضرور بنایا ہے۔ بایں ہمہ کلام کی رنگینی اور معنی آفرینی کے ساتھ سلاست زبان اور فصاحت بیان ہر طرح قابل تحسین ہے۔

نہ معلوم کس نیک ساعت میں انوار سہیلی تصنیف ہوئی تھی کہ اس کی شہرت اور مقبولیت روز بروز بڑھتی ہی رہی۔ ہم تک جو کلیلہ و دمنہ پہنچی ہے یہ اسی انوار سہیلی کا طفیل ہے۔ فارسی لٹریچر میں اس کا پایہ بہت اعلیٰ ہے اور یہ فارسی علم ادب میں ایک مشہور ترین کتاب ہے۔ اس کے ترجمے حسب ذیل زبانوں میں ہوئے ہیں:-

۱- ترکی ترجمہ | اوائل سولہویں صدی عیسوی میں علی چلپی نے ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس ترکی ترجمہ سے ایک ترجمہ فرانسیسی[2] میں ہوا اور ایک ہسپانیہ کی زبان میں[3]۔

۲- فارسی تصنیف عیار دانش | ۹۹۶ھ میں علامی ابوالفضل المتوفی ۱۶۰۳ء نے شہنشاہ جلال الدین اکبر (۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء) کی فرمائش سے انوار سہیلی کی عبارت کو رائج الوقت فارسی کے لحاظ سے بہت آسان عبارت اور سلیس زبان میں ترتیب دے کر عیار دانش کے نام سے موسوم کیا[4]۔

عیار دانش کا اُردو ترجمہ | اس عیار دانش کا مولوی حفیظ الدین احمد پروفیسر فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے ۱۸۰۳ء میں اُردو ترجمہ کیا اور خرد افروز نام رکھا[5]۔ کتاب کلیلہ و دمنہ کا اُردو زبان میں غالباً یہ سب سے پہلا ترجمہ ہے[6]۔

---

[1] مولانا کمال الدین علم و فضل میں فرد اور فصاحت و بلاغت میں یکتائے زمانہ تھے۔ تفسیر حسینی کی تصنیف نے آپ کو تمام اسلامی دنیا میں مشہور کر دیا اور انوار سہیلی کی وجہ سے تمام علمی اور ادبی دنیا میں آپ کا شہرہ ہو گیا۔ اخلاق محسنی کے بھی آپ ہی مصنف ہیں۔ ۳۰ ذی الحجہ ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۵ء میں وفات پائی (شرح انوار سہیلی ص ۳۲۵-۳۳۶ مشرحہ مولوی مرزا جان دہلوی)

[2] تاریخ کلیلہ و دمنہ ۱۸ [3] علی گڑھ منتھلی ج نمبر ۹ بابت ستمبر ۱۹۰۵ء ص ۳۶۹ و دربار اکبری ص ۵۰۵

[4] تذکرہ گلشن ہند مصنفہ مرزا علی لطف ص ۵

[5] یہ صحیح نہیں ہے اس سے بہت پہلے دکنی زبان (قدیم اُردو) میں اس کا ترجمہ ہو چکا تھا (اڈیٹر)

۲- انوارسہیلی کے اُردو تراجم

انوارسہیلی سے براہ راست تین مختلف اُردو ترجمے کئے گئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱- پہلا ترجمہ | ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۶ء میں فقیر محمد خاں گویا نے ایک ترجمہ بستانِ حکمت کے نام سے کیا اور خوب کیا۔ یہ ترجمہ ۱۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۵۱ھ مطابق ۳ مارچ سنہ ۱۸۳۶ء بروز پنجشنبہ صبح کے وقت اختتام کو پہنچا[۱]۔

بستانِ حکمت کے اڈیشن | دو اڈیشن اس ترجمہ کے مطبع جوہر ہند دہلی میں چھپے۔ آخری اڈیشن ۴۲۰ صفحات پر شائع ہوا اور گیارہ اڈیشن منشی نول کشور کے مطبع سے نکلے جن میں سے آخری اڈیشن سنہ ۱۹۱۴ء کا ہے اس کے ۵۱۶ صفحات ہیں۔ اس سے اس کتاب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ثبوت ملتا ہے۔

۲- دوسرا ترجمہ | میر بہادر علی حسینی نے اوائل انیسویں صدی میں ایک ترجمہ کیا۔ اس کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

۳- تیسرا ترجمہ | اُردو انوارسہیلی کے نام سے ایک ترجمہ نواب عمر علی خاں وحشتی ابن نواب محمد اسد علی خاں مرحوم والی ریاست محمد گڈھ باسودہ شاگرد حکیم مومن خاں دہلوی نے سنہ ۱۹۰۹ء/۱۳۲۷ھ میں کیا۔ ضیائے حکمت اس کا تاریخی نام ہے اور انوارسہیلی کی رعایت سے اس کا نام ستارۂ ہند ہے۔ یہ اسلامیہ سٹیم پریس لاہور میں ۱۸۴ صفحات پر شائع ہوا ہے[۲]۔

۳- عربی کے عبرانی تراجم

ابن المقفع کی عربی تصنیف سے دو عبرانی ترجمے کئے گئے۔ جن کی کیفیت حسب ذیل ہے:-

۱- پہلا عبرانی ترجمہ | ایک عبرانی ترجمہ سنہ ۱۲۵۰ء کے قریب کیا گیا۔ اس ترجمہ کا نہ مترجم معلوم ہے اور نہ اس کی ٹھیک تاریخ تحریر۔ اس کا ایک نسخہ نہایت ابتر حالت میں پیرس کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہے۔ ڈی سالی نے اس کے ایک حصے کو چھاپا تھا لیکن سنہ ۱۸۸۱ء میں ڈیرن برگ نے یہ پوری کتاب اور اس کے ساتھ جدید ترجمہ

---

[۱] تذکرہ گلشن ہند مصنفہ مرزا علی لطف ص ۵

[۲] ایک ترجمہ دکنی زبان میں دکنی انوارسہیلی کے نام سے بحکم بورڈ آف سپرنڈنس کالج فورٹ جارج مدراس برائے تعلیم عہدہ داران فوجی محمد ابراہیم منشی نے کیا اور کالج پریس مدراس سے سنہ ۱۸۲۴ء میں شائع ہوا اور اس سے بہت قبل ایک دکنی شاعر نے منظوم ترجمہ کیا دکنی ترجموں کے متعلق ہم کبھی علیحدہ لکھینگے (اڈیٹر)

عبرانی دونوں شائع کئے ہیں۔

عبرانی سے لاطینی | اس عبرانی کا لاطینی ترجمہ ۱۲۶۹ء میں جان آف کیپوا نے کیا۔ یہ لاطینی ترجمہ یورپ میں کتاب کلیلہ و دمنہ کی اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ ہوا ہے اور اس نے صدہا سال یورپ پر حکومت کی ہے کیونکہ اس ترجمہ سے یورپ کی بہت سی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔

لاطینی ترجمہ اور اُس کے تراجم

لاطینی ترجمہ سے مندرجہ ذیل چھ ترجمے ہوئے:۔

۱- پہلا ترجمہ انگریزی میں ہوا۔ اس کی تاریخ تصنیف معلوم نہ ہو سکی۔

۲- دوسرا ترجمہ فرنچ زبان میں ہوا۔ اس کے متعلق بھی پتا نہ چلا کہ کونسے سنہ میں ہوا تھا۔

۳- تیسرا ترجمہ اسپانش جدید میں ۱۴۹۳ء میں کیا گیا۔ اس کا ایک اڈیشن ۱۶۱۸ء میں شائع ہوا۔

۴- چوتھا ترجمہ بزبان جرمن ۱۴۸۰ء میں ہوا۔

۵- پانچواں ترجمہ ڈچ زبان میں ۱۴۸۳ء میں کیا گیا۔

۶- چھٹا ترجمہ ڈنیش میں ۱۶۱۸ء میں ہوا۔

۲- دوسرا عبرانی ترجمہ | ایک عبرانی ترجمہ عربی سے پندرہویں صدی میں ہوا جو غیر معروف اور کم مشہور رہے۔

۴- عربی کا سریانی ترجمہ

ترجمہ سریانی جدید ایک عیسائی پادری نے عربی سے دسویں یا گیارہویں صدی عیسوی میں کیا۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ حال میں ملا ہے جو کتب خانہ ڈبلن یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ اغلاط سے پُر تھا مگر اس کو نہایت محنت اور بہت کچھ تصحیح کے بعد مرحوم پروفیسر رائٹ نے ۱۸۸۴ء میں چھپوایا ہے۔

۵- عربی کا یونانی ترجمہ

عربی سے ایک یونانی ترجمہ ۱۰۸۰ء میں ہوا۔ اس کا مصنف ایک شخص سائمن سیٹ نامی تھا

جس کی اور تصنیفات بھی موجود ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۶۶۶ء میں چھپا۔

یونانی ترجمہ کے تراجم | عربی سے جو یونانی ترجمہ کیا گیا تو اس یونانی ترجمہ سے بھی تین مختلف ترجمے ہوئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ پہلا ترجمہ | ۱۶۹۷ء میں اس یونانی کا ایک لاطینی ترجمہ شائع ہوا۔ اور اصل یونانی ترجمہ بھی اس کے ساتھ شامل کر لیا گیا۔ اس لاطینی ترجمہ کا ایک اڈیشن ۱۸۵۱ء میں دوبارہ چھاپا گیا۔

۲۔ دوسرا ترجمہ | ۱۵۸۳ء میں پھر ایک ترجمہ اصل یونانی سے لاطینی میں کیا گیا اور یہ دوبارہ ۱۸۶۲ء میں چھاپا گیا۔

۳۔ تیسرا ترجمہ | سلاوانک زبان میں ایک ترجمہ ہوا جس کی تاریخ معلوم نہ ہوسکی۔

۶۔ عربی کا لاطینی ترجمہ

عربی سے ایک ترجمہ لاطینی زبان میں بھی ہوا ہے۔ یہ منظوم تھا۔

۷۔ عربی کے اسپانش تراجم

عربی سے اسپانش زبان میں بہ تفصیل ذیل دو مختلف ترجمے ہوئے:

۱۔ پہلا ترجمہ | ۱۲۶۱ء میں ایک ترجمہ اسپانش زبان میں کیا گیا۔ یہ ترجمہ منظوم تھا۔ اس اسپانش سے ایک لاطینی ترجمہ ۱۳۱۳ء میں ہوا جس کے دو قلمی نسخے پیرس کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہیں۔

۲۔ دوسرا ترجمہ | اسپانش زبان میں ایک ترجمہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان مشہور مستشرق کانگوس نے کیا۔

یہ تھی کتاب کلیلہ و دمنہ کی جامع تاریخ اور اس کے مختلف تراجم کی مفصل کیفیت جو بیان کی گئی۔

کلیلہ و دمنہ کا شجرۂ تراجم | اب ہم ایک مفصل اور مکمل شجرہ درج کرتے ہیں جس سے ایک نظر میں معلوم ہو سکے گا کہ کلیلہ و دمنہ نے ہندوستان سے نکل کر کہاں کہاں کی سیاحت کی ہے یہ شجرہ نہایت ہی محنت و جانکاہی اور بے انتہا تلاش و اقتباس کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور امید ہے کہ شائقینِ تاریخ اس کو نہایت دلچسپی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

پروفیسر مکس ملر نے بھی کلیلہ و دمنہ کا ایک شجرہ مرتب کیا ہی جس کو شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی نے اپنی تاریخ کلیلہ و دمنہ میں نقل کرکے اپنی تحقیقات کا اُس پر اضافہ کیا ہی مگر ہمارے مرتب کردہ اس شجرہ کو جب وقت ناظرین اُس شجرہ سے ملائیں گے تو زمین و آسمان کا فرق پائیں گے۔[1]

---

[1] اُردو ترجموں کے ذیل میں دکنی ترجموں کے اضافہ کی ضرورت ہی۔ (اڈیٹر)

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن

اور

دیسی زبانوں کی تعلیم

(از اڈیٹر)

(۲)

ہندوستان کی انگریزی حکومت میں سب سے پہلی تحریر جس میں اہلِ ہند کے ئے ذریعۂ تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے مسٹر چارلس گرانٹ نے ۱۷۹۲ء میں مرتب کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی کورٹ آف ڈائرکٹرز میں پیش کی۔ اس تحریر میں اس امر پر بحث کی ہے کہ اہلِ ہند میں روشن خیالی پھیلانے کے لئے یہ لازم ہے کہ انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے۔ لیکن یہ تحریر بہت کم لوگوں کی نظر سے گزری اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اس پر کچھ زیادہ توجہ نہ کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے حالات و ضروریات کے لحاظ سے جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے عربی اور سنسکرت کے کالج قایم کئے۔ ابتدا میں انگریزی تعلیم کی تحریک غیر سرکاری تھی اور اس کے بانی بنگال کے مشہور مصلح اور محبِ وطن راجہ موہن رائے اور ڈیوڈ ہیر تھے۔ پہلا کالج جس میں انگریزی کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی ہندو کالج تھا جو انھیں دو صاحبوں نے قایم کیا تھا اور جو ہندو صاحبوں کی فیاضی پر چلتا تھا۔ بعد میں یہ کالج سرکار کی تحویل میں آگیا۔ اس کے علاوہ دوسری کوشش انگریزی تعلیم کی اشاعت میں عیسائی مشنریوں کی طرف سے ہوئی۔

اس کے بعد جب سرکار نے اشاعتِ تعلیم کی طرف توجہ کی اور اسے باضابطہ بنانا چاہا تو ذریعۂ تعلیم کا جھگڑا

پیدا ہوا اور یہ مسئلہ مجلس تعلیم عامہ (پبلک انسٹرکشن کمیٹی) میں پیش ہوا۔ سر چارلس ٹریویلین جو اس مجلس کے رُکن تھے، لکھتے ہیں کہ انگریزی زبان کا ذوق عام طور پر پیدا ہو گیا تھا اور ہر طرف سے مجلس پر زور دیا گیا کہ انگریزی تعلیم کی ترقی و اشاعت میں کوشش کی جائے۔ اب مجلس میں دو فریق ہو گئے۔ ایک فریق عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا حامی تھا اور دوسرا انگریزی زبان اور انگریزی علوم کا۔ ''مشرقیوں'' کی یہ رائے تھی کہ منظور شدہ رقم مغربی تصانیف کے عربی یا سنسکرت میں ترجمہ کرنے اور اُن طلبہ کو وظیفہ دینے میں صرف کی جائے جو ان قدیم السنہ کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ''مغربی'' یہ کہتے تھے کہ اس رقم کے صرف کرنے میں کفایت شعاری مدنظر رکھی جائے اور عربی اور سنسکرت کی وہی کتابیں خریدی یا طبع کی جائیں جو کالجوں میں حقیقی طور پر کام آسکیں اور آمدنی سے انگریزی اور دیسی زبانوں کے ذریعہ سے تعلیم دینے کے لئے نئے مدرسے قایم کئے جائیں

اس بحث کا خاتمہ لارڈ میکالے کی مشہور اور پر زور یادداشت مورخہ ۲ رفروری ۱۸۳۵ء نے ہمیشہ کے لئے کر دیا۔ یہ یادداشت لارڈ میکالے نے رُکن مجلس تعلیم عامہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ بحیثیت ممبر کونسل تحریر کی تھی اور جس نے دوسرے سال ساتویں مارچ کو گورنمنٹ رزولیوشن کی صورت اختیار کی۔ اس رزولیوشن میں صاف طور سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''سرکار انگریزی کا اصل مقصد یہ ہے کہ اہل ہند میں مغربی ادب اور سائنس کی اشاعت کرے اور تمام رقوم جو تعلیم کے لئے مخصوص ہیں صرف انگریزی تعلیم میں صرف کی جائیں نیز جو روپیہ مشرقی تصانیف کی طبع میں صرف ہوتا ہے وہ آیندہ سے اس مد میں صرف نہ کیا جائے بلکہ اس رقم سے ''ہندوستانیوں کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم دی جائے''۔

سر چارلس ٹریویلین کا بیان ہے کہ مجلس تعلیم میں تمام فریق اس بات پر متفق تھے کہ دیسی زبانوں میں ''ادب اور سائنس کی تعلیم کا کافی سامان نہیں ہے''۔ لیکن اس سے اُن کا یہ مطلب نہ تھا کہ دیسی زبانیں مطلق قابل لحاظ نہیں۔ بلکہ بخلاف اس کے ''یہ سب تسلیم کرتے تھے'' کہ ہمارا انتہائی مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ عام لوگوں میں اُنھیں کی زبان کے ذریعہ سے علم کی اشاعت کی جائے۔ لیکن اس اثنا میں یہ ضرور ہوگا کہ اس کے لئے ''مدرس تیار کئے جائیں، ادب کا سامان پیدا کیا جائے اور درمیانی اور اعلیٰ طبقوں میں اتحاد قائم کیا جائے''۔ مجلس تعلیم میں اختلاف اس امر میں تھا کہ ان اہم تعلیمی مقاصد کے حصول کے لئے ذریعۂ تعلیم کس زبان کو قرار دیا جائے

ایک طرف انگریزی تھی اور دوسری طرف عربی اور سنسکرت۔ لطف یہ ہے کہ دیسی زبان کا سرے سے ذکر ہی نہ تھا اور نہ وہ معرض بحث میں آئی۔ سرکاری رزولیوشن مؤرخہ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء میں بھی اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ لہذا مجلس تعلیم نے اس خیال سے کہ غلط فہمی پیدا نہ ہو اپنی دوسری سال کی رپورٹ میں اس مسئلہ پر بحث کی جس میں ذیل کا اقتباس پڑھنے کے قابل ہے۔

"ہم دیسی زبانوں کی تعلیم و ترقی کی اہمیت کو دل سے تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے اور ہماری رائے میں، ۷ مارچ کا حکم اس کا مانع نہیں ہے۔ اس حکم کے نفاذ سے قبل جو بحث مباحثے ہوئے ان میں دیسی زبانوں کے حقوق کو ہر فریق نے خاص طور سے تسلیم کیا۔ گورنمنٹ کی خدمت میں جو مسئلہ فیصلہ کے لئے پیش تھا وہ یہ تھا کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا زیادہ مفید ہوگا یا مشرق کی قدیم علمی زبانوں کو۔ لہذا ہمارا یہ خیال ہے کہ سرکاری احکام میں جو یہ جملے واقع ہوئے ہیں کہ "مغربی ادب اور سائنس" "صرف انگریزی تعلیم" "اہلِ ہند کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم دی جائے" اُن کا مطلب صرف یہ ہے کہ اُن اہلِ ہند کی تعلیم کے لئے جو ہمارے مدارس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے سنسکرت اور عربی پر ترجیح دی گئی ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے ان جملوں کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کہ آگے چل کر عام لوگوں میں اشاعت تعلیم کا ذریعہ کون سی زبان ہوگی۔ اگر انگریزی زبان کا مسئلہ رہ جاتا تو بھی لوگ اپنی زبانوں کے ذریعہ سے اُسی طرح علم حاصل کرتے ...... ہمارا انتہائی مقصد یہ ہے کہ دیسی علم ادب کو بنائیں اور ترقی دیں اور ہماری تمام ہمت اور کوشش اسی پر صرف ہو۔"

بہرحال اُس وقت سرکار کا منشا یہی تھا کہ انگریزی زبان کو ترجیح دی جائے۔ گو اس کا مطلب یہ نہ ہو کہ وہ دیسی زبانوں کو پامال کرنا چاہتی ہے۔ اگرچہ لارڈ میکالے کی یادداشت میں مشرقی السنہ وعلوم کی سخت مخالفت کی گئی اور اُن کی بُری طرح ہنسی اُڑائی گئی تاہم اُس یک طرفہ اور نا ملایم تحریر میں یہ الفاظ بھی درج ہیں۔

"ہمیں سر دست صرف یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ایک گروہ ایسے تعلیم یافتہ ہندیوں کا تیار کر دیں جو ہمارے اور ہمارے کثیر التعداد رعایا کے درمیان ترجمان کا کام دے سکے ..... ملک کی دیسی زبانوں کی تعلیم و ترقی کا کام بھی اسی گروہ کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے کہ مغربی لغات سے علمی اصطلاحات لے کر اپنی دیسی زبانوں کو

مالامال کریں اور بتدریج اس قابل بنا دیں کہ انھیں کے ذریعۂ عوام تک علوم پہنچائے جا سکیں“۔

اس کے بعد ڈائرکٹران ایسٹ انڈیا کی طرف سے تعلیم ہندوستان کے متعلق ۱۸۵۴ء میں ایک مبسوط یادداشت شائع ہوئی جس میں اُنھوں نے اپنی تعلیمی پالیسی کا اعلان نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر بہت مسرت ظاہر کی ہے کہ اہلِ ہند نے مغربی علوم اور انگریزی علم ادب میں اعلیٰ قابلیت اور کمال حاصل کیا ہے اور اسے بہت کچھ سراہا ہے اور اپنی یہ خواہش بیان کی ہے کہ وہ اس قسم کے مغربی علم کی اشاعت کے ذرائع اور وسیع کریں گے اور اس میں آسانیاں پیدا کریں گے جو اہلِ ہند کی زندگی کے مختلف شعبوں میں عملی طور سے مفید ثابت ہو۔ اس کے بعد انھوں نے ذریعۂ تعلیم کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ چونکہ دیسی زبانوں اور مشرق کی علمی السنہ میں ترجموں کی کمی ہے لہٰذا مغربی علم کی کنجی صرف انگریزی زبان ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں اور خاص کر پریسیڈنسی شہروں کے قرب وجوار میں لوگ عموماً انگریزی کو ملازمت یا بسراوقات کے خیال سے دوسری زبانوں پر ترجیح دیتے ہیں اور انگریزی کے اوسط درجہ کے علم کو بجائے اس کے کہ عام علم کی ترقی کا زینہ خیال کریں۔ تعلیم کا مقصد اور انتہا سمجھنے لگتے ہیں۔ اب ہم اُس عبارت کا ترجمہ نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے اپنی تعلیمی پالیسی کو صراحت سے بیان کیا ہے۔

”ہماری نہ یہ کبھی خواہش تھی اور نہ یہ مقصد تھا کہ دیسی زبانوں کے بجائے انگریزی زبانوں کو رائج کیا جائے ہمیں اُن زبانوں کی اہمیت کا ہمیشہ خیال رہا ہے جنھیں لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے فارسی کے بجائے انگریزی کو نہیں بلکہ انھیں زبانوں کو عدالتوں میں تصفیہ معاملات اور رعایا اور سرکاری عہدہ داروں کے مابین آپس کے میل جول کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ عام نظام تعلیم میں ان زبانوں کی تعلیم خاص طور پر داخل کی جائے اور ترقی یافتہ مغربی علم کی روشنی عوام میں کسی نہ کسی دیسی زبان کے ذریعہ سے پہنچائی جائے، کیوں کہ ہر شخص کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکتا اور نہ ہر شخص سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ غیر زبان کی مشکلات پر غالب آ سکے گا۔

البتہ عام نظام تعلیم میں یہ ضرور ہے کہ انگریزی زبان جہاں کہیں اس کی ضرورت ہو، پڑھائی جائے۔ لیکن

اس کی تعلیم خاص توجہ کے ساتھ مقامی دیسی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے اور ایسی عام تعلیم کے ساتھ ہو جو دیسی زبانوں کے ذریعہ سے دی جا سکے۔ اور اگرچہ اُن لوگوں کے لئے جنھوں نے انگریزی زبان کا اس قدر علم حاصل کر لیا ہی کہ وہ اس کے ذریعہ سے عام تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ انگریزی زبان ایک کامل ذریعۂ تعلیم ہو گی، لیکن اُس کثیر تعداد کو جو انگریزی سے بہت کم واقف ہی، یا بالکل واقف نہیں دیسی زبانوں ہی کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے۔ یہ کام اُن معلّموں اور پروفیسروں کے ذریعہ سے بخوبی انجام پا سکتا ہی جو خود انگریزی اچھّی طرح جانتے ہیں اور علم کی موجودہ ترقیوں سے خوب واقف ہیں۔ یہ حضرات اُن معلومات کو جو اُنھوں نے حاصل کئے ہیں اپنے اہل وطن کو اپنی مادری زبان کے ذریعہ پہنچا سکتے ہیں اور جوں جوں دیسی زبانوں کی اہمیت زیادہ محسوس ہوتی جائے گی، دیسی زبانوں کے سرمایہ میں مغربی تصانیف کے ترجموں یا جدید تصانیف سے قابل قدر اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور اس کام کے انجام دینے والے وہی لوگ ہوں گے جن کے دل مغربی ترقی اور خیالات سے مالامال ہیں۔ اور اس طرح ملک میں مغربی علم کی عام طور پر اشاعت ہونے لگے گی۔ اس لئے ہم انگریزی زبان نیز ہندوستان کی دیسی زبانوں کو (یعنی دونوں کو) مغربی علم کی اشاعت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور یہ ہماری تمنا ہی کہ ہم ہندوستان کے تمام مدارس میں ان دونوں کو اعلیٰ پیمانہ پر ساتھ ساتھ ترقی کرتے ہوئے دیکھیں۔"

یہ بیان نہایت واضح اور صاف ہی۔ لیکن جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں یونیورسٹیاں قایم ہوئیں تو اس مسئلہ کی صورت ہی دگرگوں ہو گئی اور دیسی زبانوں کی ترقی کا خیال محض خواب ہو گیا۔ جن لوگوں نے ۱۸۵۴ء کا ڈسپیچ یعنی یادداشت تحریر کی تھی، انھیں کی سفارش پر یونیورسٹیاں بھی قایم کی گئیں۔ اُن کی یہ رائے تھی اور یہ رائے اُس وقت بلا تردید صحیح خیال کی گئی تھی کہ ہندوستان میں جدید طریقہ کی اعلیٰ تعلیم صرف انگریزی زبان کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہی۔ اسی کے ساتھ اُن کا یہ خیال بھی تھا کہ سرکاری عہدوں کے لئے اُن تعلیم یافتہ نوجوانوں کا انتخاب کیا جائے جنھوں نے یونیورسٹی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہی یا یونیورسٹی میں کسی قسم کا امتیاز حاصل کیا ہی۔ سرکاری ملازمت کے لالچ نے مجوزہ اور مروّجہ طریقہ پر مُہر کر دی۔

کلکتہ یونیورسٹی کے بانیوں نے اوّل اوّل مذکورۂ بالا یادداشت کے منشا کے مطابق عمل کیا اور انٹرنس کے

امتحان کے قواعد میں یہ قرار دیا کہ اُمیدوار جغرافیہ، تاریخ اور ریاضی کے سوالات کے جوابات کسی زندہ دیسی زبان میں ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ تعلیمی کمیشن بابت ۱۸۸۲ء کے صوبہ بنگال کی مجلس نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا ہے کہ "اس سے یہ توقع تھی کہ اس قاعدے کے تحت میں اس قسم کے مدارس پیدا ہو جائیں گے جن میں انگریزی صرف زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے گی اور باقی تمام مضامین کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے دی جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ضرورت سے مجبور ہو کر درسی اور دوسرے علمی کتابیں تالیف کی جائیں گی جو عام لوگوں میں مغربی علم کی اشاعت کا موجب ہوں گی۔"

اِس مجلس کا بیان ہے کہ یہ توقعات بہت کچھ پوری ہو جاتیں اگر دیسی زبان میں سوالات کے جوابات ادا کرنے کی اجازت بحال رہتی۔ لیکن کلکتہ یونیورسٹی نے یہ اجازت منسوخ کر دی اور ۱۸۶۲-۱۸۶۱ء میں یہ قاعدہ قرار دیا کہ ہر شعبہ میں (سوائے اُن سوالات کے جن کے متعلق خاص طور سے ہدایت کی گئی ہو) تمام جوابات انگریزی میں ادا کئے جائیں۔ گویا اس طرح یونیورسٹی نے دیسی زبانوں کے گلے پر چھری پھیر کر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیدیا۔ اور مذکورۂ بالا یادداشت کا مقصد فوت ہو گیا۔

۱۸۶۴ء میں اس یونیورسٹی نے (جو بجا طور سے ہندوستان کی مکھیا یونیورسٹی خیال کی جاتی ہے) دیسی زبانوں کے ایک اور ہیر کہ دیا۔ یعنی ایف اے اور بی اے کے نصاب سے دیسی زبان کو بالکل خارج کر دیا۔ اس سے قبل اُمیدوار کو اجازت تھی کہ خواہ کوئی قدیم علمی زبان لے یا دیسی زبان۔ نئے قاعدہ کے رُو سے دیسی زبان کی ممانعت ہو گئی۔ ۱۸۷۰ء میں خیالات نے کچھ پلٹا کھایا اور ایف۔ اے کے امتحان میں ترجمہ کا ایک پرچہ (انگریزی سے دیسی زبان میں) داخل نصاب ہوا۔ ۱۸۷۹ء میں جب لڑکیوں کے لئے قواعد بنائے گئے تو انھیں ایف اے کے امتحان میں یہ اجازت دی گئی کہ خواہ کوئی قدیم علمی زبان لیں یا دیسی زبان۔

کمیشن بابت ۱۸۸۲ء نے ایک اور دلچسپ بحث کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بحث یہ ہے کہ کس عمر میں انگریزی ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے۔ اس معاملہ میں عہدہ داران ممالک متوسط و بنگال کا بہت اختلاف تھا۔ ممالک متوسط میں طلبہ کو مڈل اسکول ہی میں انگریزی کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی تھی کیوں کہ اُن کے خیال میں اگر طالب علم نیچے سے تیار ہو کر جائے گا تو ہائی اسکول میں اچھا رہے گا۔ لیکن بنگال کے عہدہ داروں نے اپنے تجربہ کی بنا پر

یہ بیان کیا کہ وہ طالب علم جو دیسی زبان میں تعلیم پاکر آتے ہیں اُن طالب علموں کے مقابلہ میں جنھوں نے انگریزی میں تعلیم حاصل کی ہی ہمیشہ ممتاز رہتے ہیں۔ خود اہلِ کمیشن کی بھی یہی رائے تھی کہ نیچے کے درجوں میں انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینا عام تعلیم کو نقصان پہنچاتا ہی۔ انھوں نے یہ سفارش کی کہ مڈل اسکولوں میں ذریعہ تعلیم دیسی زبان ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن اس سے آگے وہ نہیں بڑھے اور یہ نہیں بتایا کہ ہائی اسکولوں میں کیا عمل ہونا چاہیئے۔ اس معاملہ کو انھوں نے مقامی گورمنٹوں پر چھوڑ دیا کہ وہ مقامی حالات کے لحاظ سے اس کا فیصلہ کریں اور اسکولوں کے منتظموں کو اس معاملہ میں پوری آزادی دی جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ۱۸۹۲ء تک بنگال میں عام دستور یہ تھا کہ ہائی اسکول کا تمام نصاب انگریزی زبان ہی کے ذریعہ سے پڑھایا جاتا تھا۔ لیکن عہدہ داران تعلیمی نے دیسی زبان کا بھی تجربہ کیا تھا اور انھوں نے سفارش کی کہ سرکاری اور امدادی مدارس میں اُس جماعت سے جسے آج کل آٹھویں جماعت کہتے ہیں (دسویں جماعت سب سے اعلیٰ جماعت ہی) انگریزی ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے۔ مسٹر ناتھن ناظم تعلیمات صوبہ بنگال نے اپنی پنجسالہ رپورٹ بابت ۹۷-۱۸۹۶ء تا ۰۲-۱۹۰۱ء میں اس بحث و اختلاف کا ذکر کیا ہی! ایک فریق کی تو یہ رائے ہی کہ انگریزی کو شروع ہی سے ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے۔ دوسرا فریق یہ کہتا ہی کہ اگر طلبہ کو ابتدا میں دیسی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دی گئی تو وہ انگریزی زبان نیز دوسرے مضامین میں اچھے رہیں گے اور دماغی ترقی کے لحاظ سے یہ طلبہ بہتر رہیں گے۔ اس تمام بحث کے بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اس وقت بخلاف سابق عام رجحان یہ ہی کہ انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم ذرا بڑی عمر میں دینی چاہیئے۔

کمیشن منعقدہ ۱۹۰۲ء نے انگریزی کو ابتدائی عمر میں ذریعہ تعلیم قرار دینے کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہی۔ اس رپورٹ کے بعض مقامات پڑھنے کے قابل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"ہندوستانی یونیورسٹیوں کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی زبان کے ذریعہ سے مغربی علوم کی اعلیٰ تعلیم شائع کی جائے۔ اس لیے انگریزی زبان کی مناسب تعلیم ہائی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں نہایت

ضروری ہے۔ باوجود اِس خاص امتیاز کے جو انگریزی زبان کو یونیورسٹی کی تعلیم میں حاصل ہے، نتائج مایوس کُن ہیں۔ طلبہ جب میٹرکولیشن میں کامیاب ہو کر کالج میں داخل ہوتے ہیں تو اُن میں اتنی استعداد بھی نہیں ہوتی کہ انگریزی لکچر اچھی طرح سمجھ لیں۔ بعض حالتوں میں تو یہ مشکل کچھ عرصہ کے بعد رفع ہو جاتی ہے لیکن اکثر طلبہ کی یہ حالت ہے کہ یونیورسٹی کا پورا نصاب ختم کر لینے کے بعد بھی انگریزی پر کچھ قدرت نہیں ہوتی۔ ڈگری مل جاتی ہے لیکن اتنی بھی انگریزی نہیں آتی کہ صحیح اور فصیح زبان میں ایک چھٹی لکھ لیں۔ اِن میں سے جو انگریزی تحریر و تقریر پر قادر ہیں، اُن میں ایک یہ عیب پایا جاتا ہے کہ اُن کا تلفظ بہت خراب اور مکروہ ہوتا ہے۔ یہ عیب ابتدائی تعلیم کا ہے۔ والدین کی بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح امتحان سے نکل جائے اور مدرسوں کے منتظمین پر طرح طرح سے زور ڈالتے ہیں کہ بچے کو ترقی مل جائے خواہ وہ جماعت کے قابل ہو یا نہ ہو۔ لڑکے ایک تو انگریزی زبان پڑھتے ہیں اور اس کے ساتھ دوسرے مضامین بھی انگریزی ہی کے ذریعہ سے سیکھتے ہیں۔ حالاں کہ اُس وقت اُن میں اس کے سمجھنے کی بھی استعداد نہیں ہوتی۔ پھر پڑھانے والے مدرس بھی کم لیاقت اور کم تنخواہ کے ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں جو عیب پیدا ہو جاتے ہیں وہ مشکل سے نکلتے ہیں۔ ہائی اسکول میں پہنچنے کے بعد بھی ایسے معلّم نہیں ملتے جن کی مادری زبان انگریزی ہو اور اس لئے جیسی چاہیئے انگریزی زبان کی تعلیم نہیں ہوتی بہت سے ایسے طالب علم ہیں جو میٹرکولیشن تک تعلیم پا چکے ہیں مگر انھوں نے کبھی کسی انگریز کو بولتے نہیں سُنا اور جب کبھی وہ کسی انگریز کو بولتے سنتے ہیں تو مشکل سے اُس کی بات سمجھ سکتے ہیں ...... لہٰذا ہماری یہ رائے ہے کہ اُس وقت تک انگریزی شروع نہ کرائی جائے جب تک لڑکا مضمون کو اُس زبان میں سمجھنے کے قابل نہ ہو۔ اور جن مدرسوں کی مادری زبان انگریزی نہ ہو جب تک وہ کسی ٹریننگ کالج میں تعلیم نہ حاصل کر لیں اور کوئی انگریز امتحان لے کر اُن کو زبان اور تلفظ کا صداقت نامہ نہ دے اس کام پر مقرر نہ کئے جائیں"۔

دیسی زبان کے متعلق کمیشن کی رائے حسب ذیل ہے:-

"ہمیں افسوس ہے کہ عام طور پر دیسی زبان کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور بہت سے گریجوایٹ ایسے ہیں جنھیں اپنی مادری زبان میں بہت کم استعداد ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اگر ایم اے کے نصاب میں دیسی زبانیں داخل کر دی گئیں تو اس سے ان زبانوں کے عالمانہ مطالعہ میں بہت بڑی مدد ملے گی اور چوں کہ ہماری رائے میں

اعلیٰ تعلیم کا نصاب یونیورسٹی کی نگرانی میں ہونا چاہیئے۔ لہٰذا یونیورسٹی کو اپنے سرمایہ سے دیسی زبانوں کے پروفیسروں کے تقرر کی گنجائش نکالنی چاہیئے۔ ہماری یہ رائے بھی ہے کہ گو بی اے میں دیسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام نہ ہو تاہم اس کے نصاب میں دیسی زبان کی انشا پردازی ہر طالب علم کے لئے لازم ہونی چاہیئے۔ جہاں کہیں ترجمہ داخل نصاب ہے وہاں ایک طور سے دیسی زبان کی حیثیت قایم ہو چکی ہے۔ اس کے متعلق جو شہادتیں ہمارے سامنے پیش ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ عموماً لفظی ہوتا ہے اس اصول کے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ترجمہ اُسی وقت قابل اطمینان خیال کیا جائے گا جب کہ وہ محاورہ اور قواعد اصول سے ٹھیک ہو۔ اس کے علاوہ دیسی زبان کی ادبی اور علمی تالیفات کے لئے انعامات مقرر کر کے حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

جب تک اسکولوں میں دیسی زبانوں کی مناسب تعلیم نہ دی جائے گی یونیورسٹی کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس وقت اس کی طرف سے عموماً غفلت کی جاتی ہے اور یہ مضمون کم لیاقت اور کم تنخواہ یاب مدرسین کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ دیسی زبانوں اور انگریزی دونوں کے لئے اچھے اُستادوں کی شدید ضرورت ہے۔ ہر طالب علم کے لئے اسکول کے نصاب کی تکمیل کے بعد لازم قرار دیا جائے کہ وہ اپنی زبان کا بھی امتحان دے اور یہ امتحان خاصا کڑا ہونا چاہیئے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ آسانی اور خوبی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتا ہے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان تجاویز کا اثر کلکتہ یونیورسٹی پر ہوا اور یونیورسٹی نے چار سال بعد یعنی ۱۹۰۶ء میں نہ صرف انٹرنس (میٹرکولیشن) کے امتحان میں دیسی زبان کا امتحان لازمی قرار دیا بلکہ اس امر کی بھی اجازت دی کہ جو طالب علم تاریخ کا مضمون لیں انھیں اختیار ہوگا کہ اس کے سوالات کے جوابات چاہے انگریزی میں دیں یا اپنی مادری زبان میں۔ علاوہ اس کے بی۔ اے کے امتحان میں دیسی زبان کی انشا پردازی بھی لازم قرار دی گئی ہے۔ گویا ایک زمانہ کے بعد یونیورسٹی نے پھر اس کی طرف عود کیا۔

۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے بذریعہ رزولیوشن پھر دیسی زبانوں کی طرف توجہ دلائی۔ گورنمنٹ نے منجملہ دیگر الزامات کے موجودہ نظام تعلیم کے خلاف یہ الزام بھی قایم کیا کہ "انگریزی تعلیم کے پیچھے دیسی زبانوں

کی طرف سے غفلت کی جاتی ہی اور ۱۸۵۴ء کی یاد داشت میں جو یہ توقع کی گئی تھی کہ یہ زبانیں عوام میں مغربی علم کی اشاعت کا ذریعہ ثابت ہوں گی اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس رزولیوشن کے مفصلہ ذیل اقتباس سے گورنمنٹ کی رائے کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہی۔

گورنمنٹ کی کبھی یہ پالیسی نہیں رہی کہ وہ ملکی زبانوں کی بجائے انگریزی کو رائج کرے۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی کی قیمت تاجرانہ حیثیت رکھتی ہی دوسرے اس وجہ سے کہ ہائی اسکولوں کا آخری امتحان انگریزی میں ہوتا ہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی قبل از وقت شروع کرادی جاتی ہی اور یہی نہیں بلکہ ذریعہ تعلیم بھی وہی ہوتی ہی۔ اور انھیں وجوہ سے اِن مدارس میں دیسی زبانیں پس پشت ڈال دی جاتی ہیں۔ لیکن صحیح طریقہ تعلیم کی اغراض کے لئے یہ ضرور ہی کہ اِس کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے۔ عام طور پر جب تک کہ بچہ تعلیم کے ابتدائی مراحل طے نہ کرلے اور اُسے اپنی مادری زبان میں اچھی استعداد پیدا نہ ہو جائے انگریزی شروع نہ کرائی جائے۔ ہندوستان کے مدارس میں جو عام طور سے یہ دستور پایا جاتا ہے کہ طالب علم اکثر بے سمجھے نصاب کی کتابوں یا معانی یا حواشی کی کتابوں سے جملے اور عبارتیں رٹ لیتے ہیں تو اس کی اصلی وجہ یہ ہی کہ قبل اس کے کہ طالب علم میں انگریزی کی اتنی استعداد پیدا ہو کہ وہ کسی مضمون کو سمجھ لے، نصاب کے مضامین انگریزی زبان کے ذریعہ سے پڑھانے شروع کردیئے جاتے ہیں۔ دیسی زبان کب تک ذریعہ تعلیم رہے اور انگریزی زبان کس وقت ذریعۂ تعلیم بنے اس کے متعلق ہمارا عام اندازہ تیرھواں سال ہی۔ اس کے بعد بھی ہائی اسکولوں میں دیسی زبان کی تعلیم ترک نہ کی جائے بلکہ نصاب مدرسہ کے آخر تک اسے جاری رکھا جائے۔ اگر تعلیم یافتہ اصحاب اپنی زبانوں کی طرف سے غفلت کریں گے تو اُن کی زبانیں محض بات چیت کی اور بازاری بولیاں رہ جائیں گی اور اُن میں کسی قسم کا علم ادب پیدا نہ ہونے پائے گا اور اُن میں کبھی اس قدر ترقی نہ ہوگی کہ ہم اُس اُصول کو عمل میں لاسکیں جو ۱۸۵۴ء کی یاد داشت میں قرار پایا تھا۔ یعنی یہ کہ مغربی علم رفتہ رفتہ دیسی زبانوں کے ذریعہ سے ملک کے عام لوگوں تک پہنچایا جائے۔"

گورنمنٹ کے رزولیوشن بابت ۱۹۱۳ء میں یہ بیان کیا گیا ہی کہ "اس بات کی کافی شہادت موجود ہی کہ جن طلبہ نے مدارس میں دیسی نصاب کی تکمیل کی ہی وہ دماغی لحاظ سے زیادہ مستعد پائے گئے ہیں۔"

اسی رزولیوشن میں اس امر کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بعض صوبوں میں اُن طلبہ کے لئے جنھوں نے مدرسہ کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے حاصل کی ہے۔ انگریزی زبان کی تحصیل کی غرض سے خاص جماعتیں (اسپشل کلاسیں) کھولی گئی ہیں۔ اور مقامی گورنمنٹوں سے یہ سفارش کی گئی ہے کہ جہاں کہیں یہ طریقہ رائج ہو وہاں اِس کا انتظام کیا جائے۔

۱۷ مارچ ۱۹۱۵ء کو مسٹر رام رایا ننگار نے شاہی مجلس وضع قوانین (امپیریل لیجلیٹو کونسل) میں ذریعۂ تعلیم کے متعلق مفصلۂ ذیل تجویز (یعنی رزولیوشن) پیش کیا۔

"یہ مجلس گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ صوبہ داری حکومتوں (گورنمنٹوں) کے مشورہ سے ایسی تدابیر عمل میں لائی جائیں کہ تمام مدارس ثانویہ میں ہندوستانی طالب علموں کے لئے تعلیم کا ذریعہ ہندوستانی زبانیں قرار پائیں اور انگریزی زبان بحیثیت دوسری زبان کے لازمی طور سے سکھائی جائے۔"

اِس تجویز کے پیش ہونے پر ہندوستانی ارکان مجلس میں بہت سخت اختلاف رائے ہوا۔ میں اُن قابل وطن پرستوں کے نام لینا نہیں چاہتا جنھوں نے اس تجویز کی مخالفت میں آوازیں بلند کیں۔ کونسل کی روئداد موجود ہے اس میں اُن صاحبوں کی تقریریں منقول ہیں۔ لیکن یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ یا تو یہ کونسلیں ہماری نیابت نہیں کرتیں یا ہم نے ابھی کوئی رائے ہی قایم نہیں کی ہے۔ جب ارکان کونسل کی بحث ختم ہو چکی تو سر ہارکورٹ بٹلر نے (جو اُس وقت سرکاری رُکن تعلیم تھے) یہ فرمایا کہ سرکار کی یہ مُسلّمہ پالیسی ہے کہ یہ تیرہ سال کی عمر تک ذریعۂ تعلیم دیسی زبان ہی ہونی چاہیئے۔ اب فیصلہ طلب صرف اتنی بات رہ جاتی ہے کہ آیا باقی تین یا چار اعلیٰ جماعتوں میں ذریعۂ تعلیم دیسی زبان ہی رہے۔ اب جو تجویز پیش ہوئی ہے اُس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انگریزی زبان کی تعلیم کم کر دی جائے بلکہ انگریزی کی تعلیم فطرتی طریقہ سے دی جائے اور اسی کے ساتھ دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر طلبہ کا دماغی بار کم کر دیا جائے تو یہ مسئلہ "تعلیمی پالیسی" کا نہوا بلکہ "تعلیمی کفایت" کا ہُوا سر ہارکورٹ نے یہ اعتراف کیا کہ میرا اور بہت سے قابل ماہرانِ تعلیم کا تجربہ یہ ہے کہ جس لڑکے کی تعلیم اسکول (اپر مڈل اسکول) کے آخری درجہ تک دیسی زبان کے ذریعہ سے ہوئی ہے وہ اُس لڑکے سے بہت زیادہ ذہین پایا گیا جس نے اپنی تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے حاصل کی تھی انھوں نے کہا کہ میری رائے میں یہ

معاملہ جنگ کے بعد بغیر کسی رائے کے مشورہ کے لئے مقامی گورنمنٹوں کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ اس پر مسٹر راپانگار نے اپنی تجویز واپس لے لی۔

جنوری ۱۹۱۷ء میں دہلی میں ایک کانفرنس تمام نظمائے تعلیمات (ڈائرکٹران پبلک انسٹرکشن) کی منعقد ہوئی اور اسی سال اگست کے مہینے میں شملہ میں ایک اور مجلس کا انعقاد ہوا جس میں تمام لوکل گورنمنٹوں کے نائب شریک تھے۔ ان مجلسوں میں یہی مسئلہ پیش تھا کہ مدارس ثانویہ میں انگریزی اور دیسی زبانوں کی کیا صورت ہونی چاہیئے۔ وائسرائے (لارڈ چیمسفورڈ) نے ان دونوں مجلسوں میں تقریریں کیں اور اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اس دوسری مجلس میں وائسرائے نے اوّل تو گورنمنٹ کی گزشتہ پالیسی کا ذکر کیا۔ پھر یہ بتایا کہ دیسی زبانوں کی ترقی اور انگریزی تعلیم کی اصلاح بہت اہم ہے۔ اس کے بعد اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ "اس بات کا فیصلہ بہت ضروری ہے کہ ذریعۂ تعلیم کے لحاظ سے انگریزی اور دیسی زبانوں کی کیا حیثیت ہے۔ ان سب امور کے طے کرنے میں ہمارے مدنظر یہ ہونا چاہیئے کہ طالب علم کو اس کی تعلیم سے تا امکان زیادہ فائدہ پہنچے۔

مسٹر سنکرن نائر اس کے میر مجلس تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس مجلس کے انعقاد کا منشا یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں کیا تغیّر و تبدل یا ترمیم و اصلاح کی جائے (۱) طالب علم کو جو مضمون پڑھائے جاتے ہیں وہ انھیں پوری طرح سمجھ لے (۲) اور انگریزی زبان کا علم مدرسہ کے نصاب کے ختم پر زیادہ بہتر ہو۔

اوّل میر مجلس نے انگریزی زبان کی تعلیم کے متعلق چند امور بحث و مشورہ کے لئے پیش کئے۔ مثلاً انگریزی کس وقت شروع کرائی جائے۔ کیا ابتدا ہی سے انگریزی شروع کرا دی جائے تا کہ طالب علم کو آخر میں اس پر پوری قدرت حاصل ہو جائے؟ یا اُس وقت شروع کرائی جائے جب کہ اُسے اپنی زبان میں اچھی خاصی استعداد حاصل ہو چکی ہو؟

کیا انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنے سے لڑکوں کو زبان انگریزی خاطر خواہ آجاتی ہے یا یوں ہی غلط سلط یا شُد بُد آتی ہے؟

اُن طلبہ کے متعلق عام رائے یا تجربہ کیا ہے جنھوں نے ورنیکلر مڈل میں کامیابی حاصل کی ہے (یعنی جنھوں نے دیسی زبانوں کے ذریعۂ تعلیم حاصل کر کے مڈل کا امتحان پاس کیا ہے) اور اس کے بعد ہائی اسکول میں

داخل ہو کر انگریزی سیکھی ہے؟ اِن طالب علموں کی حالت اُن طلبہ کے مقابلہ میں کیسی رہتی ہے جنھوں نے ابتدا سے انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کی ہے؟

انگریزی کے پڑھانے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں؟ کیا موجودہ طریقہ تعلیم میں انگریزی علم ادب کو زیادہ وقعت دی جاتی ہے اور صحیح انگریزی بولنے اور لکھنے پر زیادہ توجہ نہیں کی جاتی؟ ابتدائی زمانہ میں تعلیم بالکل زبانی ہونی چاہیئے یا نہیں؟

کیا اُن طلبہ کا علم جو دیسی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں بہ نسبت اُن ہم عمر طلبہ کے جو انگریزی کے ذریعہ سے تمام مضامین پڑھتے ہیں زیادہ بہتر ہوتا ہے اور وہ اپنے نصاب کے مضامین میں زیادہ مستعد ہوتے ہیں؟

کثرت رائے سے یہ امور طے پائے۔

۱۔ جو طالب علم چند سال تک اپنی زبان سیکھنے کے بعد انگریزی مدارس میں آتے ہیں وہ عموماً سوائے انگریزی زبان کے دوسرے مضامین میں اُن طلبہ سے بہتر ہوتے ہیں جو ابتدا ہی سے انگریزی زبان سیکھتے ہیں

۲۔ جو طالب علم چند سال تک اپنی زبان سیکھنے کے بعد انگریزی مدارس میں داخل ہوتے ہیں وہ انگریزی زبان میں بہ نسبت اُن طلبہ کے جو ابتدا سے انگریزی پڑھتے ہیں کمزور رہتے ہیں۔

۳۔ انگریزی کافی استعداد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مدرسہ میں جہاں تک جلد ممکن ہو انگریزی زبان شروع کرادی جائے۔

۴۔ موجودہ حالات میں اپنی زبان میں تین سال تعلیم پانے کے بعد نو اور گیارہ برس کی عمر کے درمیان انگریزی میں تعلیم شروع کرائی جائے (اس میں بعض نے ترمیم پیش کی کہ بجائے تین کے دو سال ہونے چاہئیں بعض نے بجائے دو کے چار سال کی ترمیم کی)

اس کے بعد میر مجلس نے ہائی اسکولوں کے ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ پیش کیا اس کے متعلق مفصلۂ ذیل سوالات بحث کے لئے پیش ہوئے۔

(۱) غیر زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے سے کہاں تک

(۹) حصول علم میں رُکاوٹ ہوتی ہے۔ خیال کی جدت و آزادی زائل ہو جاتی ہے، اور درسی مضامین کی تحصیل کے لئے رٹنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے؟

(ب) دیسی زبان میں مقابلۃً مناسب درسی کتب کا نہ ہونا، دیسی زبانوں میں اصطلاحات علمی کی کمی اور دیسی زبانوں کا مختلف اور متعدد ہونا، کیا یہ ایسی رُکاوٹیں ہیں جن کی وجہ سے دیسی زبانوں کا ذریعۂ تعلیم ہونا ممکن نہیں؟

(ج) کیا انگریزی کو بتدریج ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے یا نہیں؟ اگر یہ ہو تو کس عمر میں اور کس حد تک؟

(د) یہ کس حد تک مناسب ہوگا کہ اسکول کے نصاب کے اختتام پر بعض مضامین کا امتحان دیسی زبانوں کے ذریعہ سے لیا جائے۔

بعد بحث کے مفصلۂ ذیل رزولیوشن مجلس کے سامنے پیش کئے گئے۔

(۱) ہائی اسکول کی تمام جماعتوں میں دیسی زبان ذریعۂ تعلیم ہونی چاہیئے۔

فضل حسین، سیتا چرن دوبے اور نائک صاحبان نے اس تجویز کی تائید کی۔

سیش ایار، رچی، کنھیا لال گرو اور دیوا دھر صاحبان نے تجویز اس شرط کے ساتھ منظور کی کہ اس میں ان الفاظ کا اضافہ کیا جائے "سوائے انگریزی کے جہاں تک ممکن ہو دوسرے مضامین میں"۔

۲- ہائی اسکول کی آخر کی دو جماعتوں میں اصل ذریعۂ تعلیم انگریزی ہونا چاہیئے۔

ڈی لا فوس، سیوا کمار شاستری ایار، مولوی احسان اللہ، ہارنل، چکرورتی، سید محمد عبد الرؤف، ہیسٹن، سٹون، دوارکا ناتھ، چٹرجی، نتربجن، دیوا دھر، کورنٹن، اور مسٹر سندر لال صاحبان نے اس تجویز کی تائید میں ووٹ دیئے۔ مسٹر سیش ایار نے اس شرط کے ساتھ اس تجویز کو منظور کیا کہ بجائے "آخر کی دو جماعتوں" کے صرف "اعلیٰ جماعت" رکھا جائے۔

سیوا کمار شاستری ایار، مولوی احسان اللہ، ہارنل، چکرورتی، ہیسٹن، سٹون، دوارکا ناتھ، چٹرجی، نتربجن، کورنٹن اور مسٹر سندر لال صاحبان نے یہ ترمیم کی کہ بجائے "دو" کے "تین" جماعتیں ہونی چاہئیں۔

مولوی احسان اللہ، ہارنل، چکرورتی، دوارکا ناتھ، چٹرجی، نتربجن، کورنٹن صاحبان نے فرمایا کہ

بجائے "دو" کے "چار" جماعتیں رکھی جائیں۔

ارکانِ کانفرنس کا اِس امر میں عموماً اتفاق تھا کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بتدریج بنایا جائے۔

پھر یہ رزولیوشن پیش کیا گیا۔

۳۔ "ہائی اسکول کے اختتام نصاب پر امتحانات سوائے انگریزی کے باقی تمام مضامین دیسی زبان میں ہونے چاہئیں"

فضل حسین اور سیتا چرن دوبے صاحبان نے اس کی تائید کی اس کے بعد یہ رزولیوشن پیش ہوا۔

۴۔ اُمیدواروں کو اختیار دیا جائے کہ وہ ہائی اسکول کے امتحان میں سوائے انگریزی کے باقی تمام مضامین کے سوالات کے جواب دیسی زبان میں دیں خواہ انگریزی میں"

ڈی لافوس، سیش ایار، رچی، فضل حسین، سیتا چرن دوبے، کھنیا لال گرو، چکرورتی، بخشی رام رتن، سید محمد عبدالرؤف، چٹرجی، دیوادھر، نائک اور کورنٹن نے اس تجویز کی تائید کی۔

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن

دیسی زبان کی تعلیم کے متعلق اِس وقت تک کی تاریخ ہم کافی وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم اس بارے میں کلکتہ یونیورسٹی کی تحقیق اور رائے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ کمیشن ہر لحاظ سے نہایت قابل وقعت ہے۔ کیوں کہ جو ارکان اس میں شریک تھے اُن کی اعلیٰ قابلیت اور فنِ تعلیم میں اُن کی بصیرت مسلّم تھی۔ نیز جن اصحاب سے انھوں نے سوالات پیش کر کے جوابات حاصل کئے ہیں وہ بھی ملک میں اپنی علمی قابلیت اور تجربہ کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ لہٰذا ایسے کمیشن کی رائے خاص طور پر عزت و امتیاز کی نگاہ سے دیکھنے کے قابل ہے۔

کمیشن کا سوال یہ تھا۔

"کیا آپ کی رائے میں میٹریکولیشن سے اوپر نصاب یونیورسٹی کے ہر درجے میں انگریزی زبان، تعلیم اور امتحان کا ذریعہ ہونی چاہیئے"

اس سوال کا جواب کچھ اوپر تین سو اصحاب کی طرف سے وصول ہوا۔ جوابات کی تقسیم اختلاف رائے کی

بنا پر مفصلۂ ذیل ہو سکتی ہی۔

(۱) ۱۲۰۔ ایسے اصحاب تھے جنھوں نے قطعی طور سے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ یعنی اُن کی رائے میں ذریعۂ تعلیم اور ذریعہ امتحان میٹرکولیشن سے اوپر یونیورسٹی کے ہر درجہ میں انگریزی زبان ہونی چاہیے

(۲) ۲۶۔ کا جواب اثبات میں تھا مگر کسی قدر شرط کے ساتھ۔ یعنی سوائے دیسی زبانوں اور سنسکرت کے باقی تمام مضامین کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہونی چاہیئے۔

(۳) ۶۸۔ کا جواب انگریزی اور دیسی زبان کے مشترکہ استعمال میں ہی یعنی یا تو ان کا استعمال ساتھ ساتھ ہو یا دو الگ الگ تعلیم گاہیں ہوں۔ ایک میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو دوسرے میں دیسی زبان (آخری تجویز کی تائید میں صرف چند اصحاب ہیں)

(۴) ۳۴۔ کی رائے یہ ہی کہ بتدریج انگریزی کی بجائے دیسی زبان کردی جائے۔

(۵) ۳۷۔ کا جواب قطعی نفی میں ہی۔

(۶) ۹۔ اصحاب ایسے ہیں کہ اُن کے جواب کسی تقسیم کے تحت میں نہیں آسکتے۔

اس تقسیم کی (جو کمیشن نے بڑے احتیاط سے کرائی ہی) اگر تنقید کی جائے تو مختلف اصحاب کسی قدر مختلف نتائج پر پہنچیں گے۔ پہلے ہم کمیشن کی رائے دیکھتے ہیں۔ کمیشن نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہی کہ جو اصحاب موجودہ نظام تعلیم کو (کسی قدر خفیف تغیر کے ساتھ) قایم رکھنا چاہتے ہیں اُن کی تعداد نصف سے کسی قدر زیادہ ہی۔ ایک چوتھائی ایسے ہیں جن کا منشا یہ ہی کہ انگریزی اور دیسی زبان کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو۔ ایک آٹھواں ایسے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بتدریج انگریزی کی جگہ دیسی زبان کردی جائے۔ بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے قطعی طور سے یہ کہا ہو کہ انگریزی کی بجائے بالکل بنگالی (یعنی دیسی زبان) کردی جائے کمیشن نے ان لوگوں کو جنھوں نے جواب محض نفی میں دیا ہی کسی شمار میں نہیں رکھا کیوں کہ اُن کے جواب سے صحیح طور سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُن کا منشا کیا ہی۔ یعنی وہ چاہتے ہیں کہ بتدریج انگریزی کے بجائے دیسی زبان کردی جائے یا نمبر۳ والوں کی طرح دونوں کے ساتھ ساتھ تعلیم چاہتے ہیں۔ اگر ہم نمبر۲ و ۴ و ۵ کو بھی ملالیں تو بھی تعداد ایک تہائی سے کم ہوتی ہی۔ زیادہ تعداد اُنھیں کی ہی جو موجودہ طرز تعلیم کے حامی ہیں۔

لارڈ میکالے کی یادداشت اور لارڈ ولیم بنٹنک کے رزولیوشن کو اس وقت پورے تاسی سال ہوتے ہیں۔ اُس وقت سے لیکر اب تک سرکار نے مختلف تحریروں، تقریروں، یادداشتوں، رزولیوشنوں، کانفرنسوں اور کمیشنوں میں اپنی پالیسی کا بار بار اعادہ کیا ہے کہ سرکار کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ دیسی زبان کے بجائے انگریزی کو رواج دے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف تو اہلِ ہند کو انگریزی زبان کے ذریعہ مغربی اعلیٰ تعلیم دے اور دوسری طرف دیسی زبانوں کی ترقی میں کوشش کرے تاکہ وہ تمام اغراض کے لئے کارآمد ہو سکیں۔ اور وہی لوگ جو اعلیٰ درجہ کی مغربی تعلیم کی تکمیل کر چکے ہیں اپنی زبان کے ذریعہ سے اپنے عام اہلِ وطن میں مغربی علوم اور خیالات کی اشاعت کریں گے۔ یہ بہت مبارک اور شریفانہ مقصد ہے۔ بشرطیکہ عمل میں آتا۔ تاسی سال کچھ کم نہیں ہوتے۔ اس عرصہ میں بیسوں انقلاب ہو گئے، سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، قوموں نے عروج و زوال کے سمے دیکھ لئے، خود ہماری دیکھتے دیکھتے کیا کچھ نہیں ہوا۔ مگر عمل نہ ہو سکا تو اس رزولیوشن پر۔ یہ تحریریں مابعد کی تحریروں اور تقریروں کے حوالہ کے لئے بہت کارآمد ہو سکتی ہیں اور بس، سرکار کی نیت نیک ہے مگر عمل میں مجبوریاں ہیں۔

اِس ناکامی کے چند وجوہ ہیں۔ اوّل سرکار نے کبھی اسے عمل میں لانے کی باقاعدہ کوشش نہیں کی۔ اس میں روپیہ کا صَرف ہے۔ یہ کام اُس وقت تک انجام پا نہیں سکتا جب تک دل کھول کے روپیہ صرف نہ کیا جائے۔ ہماری سرکار اس اسراف کو کیوں گوارا کرنے لگی۔ دوسرے سرکار کا انتظامی اور دفتری کام انگریزی خوانوں سے بخوبی نکلنے لگا، اس لئے اُسے اور بھی دیسی زبانوں کی اشاعت و ترقی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تیسرے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود اہلِ ملک نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی بلکہ انگریزی تعلیم کے لئے اصرار کرتے رہے اور انگریزی کے جوش میں کبھی یہ خیال نہ کیا کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ خیر وہ تو ابتدائی زمانہ تھا مگر اب بھی ہمارے ملک کے اہل الرّائے اس مسئلہ کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وائسرائے کی کانفرنس ۱۹۱۷ء اور امپریل لیجسلیٹو کونسل اور حال میں ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی لیجسلیٹو کونسل کی روئداد یں ہماری شامتِ اعمال پر شاہد ہیں۔

دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم و امتحان بنانے میں مفصلۂ ذیل اعتراضات کئے گئے ہیں۔

۱- دیسی زبانوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ اُن میں علمی اور اعلیٰ ادبی خیالات کا کافی طور پر اظہار ہو سکے۔

۲- دیسی زبانوں میں نصاب تعلیم کے لئے کافی تعداد میں کتابیں نہیں ہیں۔

۳- ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ذریعۂ اظہار خیالات اور عام اور مشترکہ زبان انگریزی ہے جس کی قایم مقامی کوئی دوسری زبان نہیں کر سکتی۔

۴- اس کے یہ معنی ہوں گے کہ غیر ممالک کے مُعلّم مدرسی کے عملے سے خارج کر دیئے جائیں اور ہمارے کالج بعض اعلیٰ درجہ کے پروفیسروں کی تعلیم سے محروم رہ جائیں۔

۵- دوسرے ممالک کی مثال مغالطہ انگیز ہے۔ ہندوستان کی حالت جُداگانہ ہے۔ ہندوستان برٹش امپائر (سلطنت برطانیہ) کا جزو ہے اور باہمی اتحاد کا ذریعہ انگریزی زبان ہے۔

۶- دیسی زبانوں میں علمی اصطلاحات نہیں ہیں۔

۷- ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں اور بعض زبانوں کو ذریعہ تعلیم کے لئے مخصوص کرنا بیحد مشکل ہوگا۔ اور اس میں بہت سی شکایتیں پیدا ہوں گی۔

۸- انگریزی ادب کے مطالعہ سے خود دیسی زبانوں کی ترقی مقصود ہے۔

۹- اگر انگریزی دوسری زبان ہو گئی تو اس کا وہی حال ہوگا جو اب دوسری زبانوں مثلاً فارسی، عربی، سنسکرت وغیرہ کا ہے۔

۱۰- انگریزی زیادہ ترقی یافتہ اور مُہذّب زبان ہے اور اس وقت ملک میں بہ نسبت کسی دوسری زبان کے زیادہ پڑھی جاتی ہے اور ہندوستان کے اتحاد کی اُمید بہ نسبت کسی دیسی زبان کے انگریزی زبان سے زیادہ وابستہ ہے۔

۱۱- دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانا گویا آگے جانے کے بجائے پیچھے جانا ہے۔

۱۲- دیسی زباں میں پڑھانے والے کہاں ہیں۔

۱۳- انگریزی دفتری اور سرکاری زبان ہے۔

۱۴۱- بقول مسٹر را مانند چٹرجی (اڈیٹر ماڈرن ریویو) انگریزی کا علم تہذیب ذوق کے لئے، ہندوستانی صوبوں کے باہمی تعلقات کے لئے بین الاقوامی تجارت اور مراسلت کے لئے، انتظامی اغراض کے لئے، ہندوستان کے سیاسی اتحاد کے لئے، باہمی تبادلۂ خیالات کے لئے، بیرونی دنیا سے تعلقات قایم رکھنے کے لئے، اور علم کی جدید ترین ترقیات کے لئے ناگزیر ہے۔

اس ضمن میں ہندوستان کے نامور اور بزرگ فاضل سر آر جی بھنڈارکر کی رائے کا نقل کرنا بھی ضرور معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو خیالات ہندوستانیوں کو یونیورسٹی کی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں وہ مغربی اور انگریزی ہیں۔ دیسی زبانیں ان خیالات کے ادا کرنے کی قابلیت اور صلاحیت نہیں رکھتیں۔ ہماری زبانوں میں ایسا علم ادب پیدا نہیں ہوا جو مغربی علوم کے مناسب اور موزوں ہو۔ ایسی حالت میں تعلیم اور امتحان کا ذریعہ دیسی زبانوں کو بنانا کچھ موثر نہ ہوگا۔ اگر دیسی زبان مجبوراً ہمارے سر مڑھی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک نئی زبان پیدا ہو جائے گی جو آدھا تیتر آدھا بٹیر ہوگا۔

یہ وہی اعتراضات ہیں جو اس سے قبل بارہا کئے گئے ہیں اور ان کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں۔ لیکن جب کبھی یہ مسئلہ پیش ہوتا ہے تو یہی اعتراض نئی نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس میں ایک بڑا مغالطہ یہ ہے کہ جب کبھی دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کے متعلق اصرار کیا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی سمجھ لئے جاتے ہیں کہ انگریزی کی تعلیم کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ گویا دیسی زبان اور انگریزی دو ایسے رقیب ہیں جو ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ حالاں کہ اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہوتا کہ انگریزی خارج کر دی جائے یا ہماری تعلیم میں جو وقعت یا اہمیت اُسے حاصل ہو چکی ہے اُسے کم کر دیا جائے۔ ہماری موجودہ حالت ایسی ہے کہ کم سے کم کسی ایک ترقی یافتہ یورپی زبان کا نصاب تعلیم رکھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دوسری ضرورتوں کے علاوہ انگریزی زبان کا علم خود دیسی زبانوں کی ترقی کے لئے مفید ہے۔ ہم جب دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے زور دیتے ہیں تو اس سے ہمارا صرف اتنا ہی مطلب نہیں کہ طالب علم کے حافظ اور دماغ پر سے بار کم ہو جائے صحت جسمانی قایم اور دماغی نقصان سے محفوظ رہے اور وہ جلد لکھ پڑھ لے۔ بلکہ ہمارا یہ یقین ہے کہ صحیح معنوں میں علم کی تحصیل خصوصاً بچپن اور لڑکپن میں بغیر اپنی زبان کے ناممکن ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ملک میں عام طور سے

علم کی اشاعت بغیر اپنی زبان کے کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوسکتی۔ مرد اور عورت، اعلیٰ، وسطانیہ اور ادنیٰ طبقوں میں جو ایک نار وا تفاوت پیدا ہوگیا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور اس کے مٹانے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تعلیم کا ذریعہ دیسی زبان ہو۔ خیالات و بیان میں جدّت پیدا کرنے کے لئے، علمی اور ادبی طرز ادا کے لئے اپنی زبان کو تحصیل علم کا ذریعہ قرار دینا ایسا ہی ضروری ہے جیسے مچھلی کے لئے پانی۔

لارڈ میکالے نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے اور اب تک وہ جملہ بار بار دُہرایا جاتا ہے کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسیٹوں کی تعلیم یافتہ مشرق و مغرب میں ترجمانی کا کام دیں گے اور ملک میں مغربی علم و خیالات کی اشاعت کریں گے۔ لیکن تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب تک غیر زبان ذریعۂ تعلیم رہے گی وہ اس فرض کو ادا کرنے کے اہل نہیں ہوسکتے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر اوقات بجائے ترجمانی کے نقالی کرنے لگتے ہیں جو زبان و ادب اور اخلاق کے لئے مضر ثابت ہوتی ہے۔ یہ ترجمانی اُسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسیٹوں میں بھی اس ترجمانی کا حق ادا کیا جائے۔ ہمارے طلبہ مغربی علم و خیالات کی اشاعت اُسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ اُن میں اُن خیالات کے ادا کرنے کی قوت پیدا کی جائے۔ اگر ستّاسی برس قبل تعلیم کا ڈھنگ وہی اختیار کیا جاتا ہے جو دنیا جہان میں رائج ہے اور جس کی صحت میں کسی ذی فہم کو کلام نہیں ہوسکتا یعنی ہماری تعلیم ہماری ہی زبان کے ذریعہ سے ہوتی اور یورپ کے نامور شعرا و ادبا، علما و حکما کی تصانیف بجائے ناقص اور بے مزہ انگریزی میں پڑھانے اور رٹانے اور اُن کے کلام کی خوبیوں کو غارت کرنے کے ہماری زبان میں پڑھائی جاتیں تو دیسی زبانوں کا علم ادب کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ شیکسپیر اور ملٹن کا کلام، ارسطو و افلاطون کی حکمت، مل اسپنسر اور ڈیکارٹ کا فلسفہ، نیوٹن اور ڈارون کے مسائل پڑھاتے ہوئے کئی قرن گزر گئے، مگر ہماری زبانیں ان خیالات و مسائل سے اب تک ناآشنا ہیں۔ اگر یہی چیزیں ہماری زبان میں پڑھائی جاتیں تو نہ صرف ان سب کی تصانیف ہماری زبان میں ہوتیں بلکہ ان پر متعدد تنقیدیں اور حواشی لکھے جاتے اور انھیں پڑھنے والوں میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے جو ان نامور ادیبوں شاعروں اور فلسفیوں کے ہم پلّہ ہوتے۔

ایک عام اور بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ دیسی زبانوں میں علوم و فنون پر ایسی کتابیں کہاں ہیں جو نصاب

میں داخل کرنے کے قابل ہوں۔ بیشک نہیں ہیں۔ اور ہوں کیوں کر جب تمام تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ یہ طلب و رسد کا معاملہ ہے۔ جس روز ذریعۂ تعلیم بدل جائے گا کتابیں خود بخود آجائیں گی اور اگر نہیں ہیں تو لکھوانی چاہئیں، انتظام کرنا چاہیئے۔

اگر آج یہ قطعی طور سے طے کر لیا جائے کہ ہر قسم کی تعلیم دیسی زبان میں ہوگی تو پھر کتابوں کا تیار کرانا کچھ مشکل نہیں۔ پہلے کتابوں کو نہیں دیکھنا چاہیئے۔ مقدم اس مسئلہ کا فیصلہ ہے، کتابیں اس کے بعد ہیں۔ یہ اعتراض کچھ نیا نہیں ہے جب سے سرکار انگریزی نے اس ملک کی تعلیم اپنے ہاتھ میں لی ہے اور انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم قرار پائی ہے اُس وقت سے بار بار یہی آواز ہمارا منہ بند کرنے کے لئے یا ہم میں سے اکثر کی تسکین کے لئے سنائی دی ہے۔ اور لارڈ میکالے اور لارڈ ولیم بنٹنگ سے لے کر سر سنکرن نائر اور لارڈ چیمسفورڈ تک اُسی ایک کلمے کو دُہراتے چلے آتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم تو چاہتے ہیں کہ تعلیم دیسی ہی زبان کے ذریعہ سے ہو مگر یہ مجبوری ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو یہ مجبوری تا قیامت یوں ہی قائم رہے گی۔

لیکن اس سے بھی قوی اعتراض یہ ہے کہ دیسی زبانوں میں اعلیٰ ادبی اور علمی خیالات کے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں۔ ۔ یہ اعتراض اس امر کو بتاتا ہے کہ معترض اپنی زبان اور دوسری زبانوں سے نیز زبانوں کے اصول نشو و نما سے ناواقف ہیں۔ دنیا کی جدید زبانوں کو لیجئے۔ ان میں کون سی ایسی زبان ہے جس میں صلاحیت تھی۔ کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ انگریزی زبان جو آج کل سیلاب کی طرح پھیلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح کم مایہ اور حقیر سمجھی جاتی تھی۔ انگلستان کے نامور مصنفین انگریزی میں تصنیف کرنا عار سمجھتے تھے۔ وہاں بھی لاطینی و یونانی اور فرانسیسی کا وہی زور تھا جیسے ہمارے ہاں سنسکرت، عربی فارسی کا وہاں بھی ہماری طرح غیر زبانوں کو ترجیح دی گئی اور اپنی زبان پامال رہی۔ کچھ عرصہ پہلے جرمن زبان کیا تھی اور اب کیا ہے۔ وہی زبان جو بے حقیقت اور وحشیوں کی زبان خیال کی جاتی تھی، آج دنیا بھر کے علوم و فنون سے مالا مال اور بھرپور ہے۔ ہم دُور کیوں جائیں جاپان کی مثال ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ ساٹھ سال پہلے اس میں ہماری زبان سے زیادہ صلاحیت نہ تھی اور اب اُن کی یونیورسٹیوں

میں تمام علوم و فنون جاپانی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اس میں یہ صلاحیت کہاں سے آگئی؟ اس جملے کے بار بار دہرانے سے کہ ہماری زبانوں میں صلاحیت نہیں ہمیں کچھ فائدہ ہوسکتا ہے نہ ہماری زبان کو۔ جہاں تک اس میں صلاحیت ہے اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے اور آگے کے لئے اس میں صلاحیت پیدا کرنی چاہیئے۔ وہ زبانیں مبارک ہیں جو اپنے ملک و قوم کے حالات کا ساتھ دیتی رہیں (اور ساتھ دینا ناگزیر تھا) اور قدرت اُن کے نشو و نما میں اپنے اصول پر خاموشی سے مدد دیتی رہی۔ وہاں کسی غیر معمولی جد و جہد کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وہ بدنصیب زبانیں جو اپنے والی وارثوں کی طرح انقلاب عالم میں مبتلا اور پامال رہ گئیں، نہ حالات نے مساعدت کی نہ قدرت نے اُن کے لئے موافق حالات کا انتظار کرنا یا قدرت کی فیاضی پر اعتماد کرکے بیٹھ رہنا ظلم نہیں خودکشی ہے۔ انسان ذی شعور اور ذی عقل ہے۔ وہ حالات کی ناموافقت، قدرت کے بخل، گزشتہ غفلت کی تلافی اپنی عقل و تدبیر سے کرسکتا ہے۔ اس لئے ہمیں غیر معمولی جد و جہد کی ضرورت ہے اور متفقہ کوشش کبھی ناکام نہیں رہتی۔

یہی صورت علمی اصطلاحات کی ہے اس مسئلہ کی بحث میں یہ اعتراض بھی بار بار پیش کیا گیا ہے۔ اصطلاحات کا پہلے سے نہ ہونا زبان کی کمی ہے لیکن اس امر کی دلیل نہیں کہ ہماری تعلیم ہماری زبان میں نہیں ہونی چاہیئے۔ اصطلاحات کا بنانا بے شبہ مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ دوسرے ممالک میں یہ ہوا کہ جوں جوں علم ترقی کرتا گیا اصطلاحات بھی بنتی گئیں۔ ہمارا ملک پیچھے رہ گیا تھا اور جدید علوم کی تعلیم شروع ہوئی تو غیر زبان میں اس سے اور بھی پیچھے ہوگیا۔ اب یہ بار اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کے خیال سے طبیعت پریشان اور ہمت پست ہوجاتی ہے۔ لیکن جو پس ماندہ افراد اور اقوام ترقی کرنا چاہتی ہیں انھیں خوش خوش اپنی گزشتہ غفلتوں کا خمیازہ بھگتنا چاہیئے اور اپنی کمی جوش اور مستعدی کے ساتھ پوری کرنی چاہیئے۔ ڈاکٹر دنیش چندرسین صاحب نے اپنے مضمون "بنگالی زبان و ادب کا نشو و نما" میں یہ خوب بات لکھی ہے کہ جن صاحبوں نے بنگالی میں سائنس پر کتابیں لکھی ہیں، انھیں کبھی اصطلاحات کی شکایت کرتے نہیں سُنا۔ بنگالی میں جب یہ صلاحیت موجود ہے تو ہندوستان کی بعض دوسری زبانیں بھی اس میں ہیٹی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر برجندرا ناتھ سیل کی (جو ادبی ذوق علم و فضل اور غائر نظری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے) یہ رائے ہے کہ ملک کی ادبی انجمنوں کے مشورہ سے اصطلاحی

الفاظ کی مسلمہ فہرستیں تیار کی جائیں اور کالجوں اور اسکولوں میں اُن کی اشاعت کی جائے تاکہ دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم و امتحان بنانے میں سہولت ہو۔

خواہ کتنی کوشش کیوں نہ کی جائے انگریزی زبان ملک کی زبان نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ وہ آیندہ ذریعہ تعلیم بھی نہیں رہ سکتی اور نہ اس وقت یہ عام اور مشترکہ زبان ہے۔ البتہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اظہار خیالات کا ذریعہ ہے اور اس حد تک اُسے مشترکہ زبان کہہ سکتے ہیں۔ اور غالباً کچھ عرصہ تک اُسے یہ حیثیت حاصل رہے گی لیکن ہمیشہ اُسے یہ حیثیت حاصل رہے اور وہ ملک کی عام اور مشترکہ زبان ہو جائے، ناممکن ہے۔ کوا کب تک ہنس کی چال چل سکتا ہے اور مستعار پروں سے کہاں تک پرواز ہو سکتی ہے۔ اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اس عالم اسباب میں ترقی و نمود کے خواہاں ہیں تو زبان کی غلامی سے نکلنا اور ذہنی و دماغی آزادی حاصل کرنا پہلی شرط ہے کوئی قوم ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتی جس کی زبان میں ادب نہ ہو، جو حکیمانہ اور شاعرانہ خیالات اور نازک و لطیف جذبات کے ادا کرنے سے قاصر ہو، جو معمولی قصّے کہانیوں اور مقبول عام گیتوں اور دوہوں سے نکل کر فلسفیانہ نکات، عالمانہ مباحث اور اعلیٰ درجہ کے اصنافِ سخن پر قادر نہ ہو، یا اس میں علوم و فنون کی سمائی نہ ہو۔ جو کوئی قوم ایسی ہے وہ بہت بڑی نعمت سے بے بہرہ ہے۔ گویا وہ گونگی بھی ہے اور ساتھ ہی بھکاری بھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اقوام عالم میں ایک گونگی اور بھکاری قوم کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اگر انگریزی ذریعہ تعلیم نہ رہی اور صرف بحیثیت زبان کے پڑھائی گئی تو اس کی وہی درگت ہو جائے گی جو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سنسکرت عربی اور فارسی کی ہے۔ اوّل تو انگریزی زبان کی حیثیت لازم مضمون کی ہوگی نہ کہ اختیاری مضمون کی۔ دوسرے جب طلبہ انگریزی کو بحیثیت زبان کے سیکھیں گے تو ان کا علم پہلے کی نسبت زبان بہتر ہوگا۔ تیسرے جب تمام مضامین اپنی زبان کے ذریعہ سے حاصل کرینگے تو انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کا زیادہ موقع ملیگا۔ چوتھے یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ انگریزی کے ذریعہ تعلیم ہونیسے انگریزی زبان کا علم زیادہ ہو جاتا ہے۔ موجودہ طرز تعلیم کی وجہ سے اُن کا زیادہ تر وقت رٹنے میں صرف ہوتا ہے اور اُن کی تعلیم بے حد ناقص ہوتی ہے نہ تو انگریزی زبان ہی اچھی طرح آتی ہے اور نہ دوسری زبان۔ سوچنے سمجھنے کے بجائے وہ حافظہ سے کام لیتے ہیں اور غور و فکر کی عادت نہیں رہتی۔ پانچویں ہمیں اپنے نصاب میں زبان

اور ادب میں فرق کرنا پڑے گا۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر طالب علم کو قدیم انگریزی زبان اور ادب کی تعلیم دی جائے جو زندگی میں کبھی اس کے کام نہ آئے گی۔ یہ حصّہ صرف اُن طلبہ کے لئے مخصوص رکھا جائے کہ جو ادیب یا زبانوں کے محقق بننا چاہتے ہیں، باقی طالب علموں کو جدید انگریزی زبان اس طرح سکھائی جائے کہ وہ لکھنا پڑھنا اپنے خیالات کا اظہار کرنا اچھی طرح سیکھ جائیں، انگریزی اخبارات، رسالوں اور کتابوں سے استفادہ کرسکیں اور دنیاوی کاروبار میں انھیں سہولت حاصل ہو۔ چھٹے زبان کے طریقۂ تعلیم میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ موجودہ طریقۂ تعلیم بہت ناقص ہے، اس میں بہت وقت صرف ہوتا ہے اور زبان جیسا کہ چاہیئے نہیں آتی۔ جدید طریقہ کے مطابق اگر زبانوں کی تعلیم پر اصلاح کردی گئی تو بہت بڑا فرق پیدا ہو جائے گا اور جو اعتراض کہ اس وقت کیا جاتا ہے وہ خود بخود رفع ہو جائے گا۔ ایسے لوگ عام کاروبار اور سرکاری دفاتر کے لئے بہت موزوں ہوں گے۔

سب سے عجیب یہ دو اعتراض ہیں کہ (۱) دیسی زبانوں میں پڑھانے والے کہاں سے آئیں گے۔ (۲) ہماری کالج بعض اعلیٰ درجے کے انگریز پروفیسروں کی تعلیم سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ دونوں اندیشے بیجا ہیں۔ جب انگریزی زبان اور انگریزی ادب کی تعلیم الگ الگ ہو جائے گی تو ہم اعلیٰ درجہ کے انگریز پروفیسروں کی تعلیم سے ہر طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے جب طلبہ کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم کا انتظام بہتر اور زیادہ باقاعدہ کردیا جائے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اعلیٰ درجہ کے انگریز پروفیسروں کی خدمات سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔ شروع شروع میں یہ اندیشہ ضرور ہوتا ہے کہ دیسی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم دینے والے کہاں سے آئیں گے کیوں کہ دیسی اور پردیسی دونوں انگریزی ہی میں پڑھاتے آئے ہیں۔ اسی طریقہ سے انھوں نے خود پڑھا اور اسی طرح وہ دوسروں کو پڑھاتے ہیں۔ سوائے اس کے سینکڑوں حواشی، تنقیدیں، نوٹ، معنی کی کتابیں انگریزی میں موجود ہیں اور ہر سال نئی نئی لکھی جاتی ہیں۔ اور اکثر اُستاد انھیں کی مدد سے طالب علموں کو کتابیں رٹوا دیتے ہیں دیسی زبانوں میں یہ سہولت کہاں، دُگنی تگنی مشکل بڑھ جاتی ہے۔ مگر باوجود اس کے ہر صوبے میں ایسے لوگ نکل آئیں گے جو اس کام کو بخوشی اور بخوبی انجام دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ یہی پروفیسر جو آج کل ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کام کر رہے ہیں۔

اگر دل پہ رکھ لیں اور محنت سے جی نہ چرائیں تو اپنی زبان میں اچھی خاصی طرح تعلیم دے سکتے ہیں۔ اور جب ایک بار یہ کام شروع ہو گیا تو پھر آیندہ مطلق دقت باقی نہ رہے گی۔ قانون اور تعلیم کے دو ایسے پیشے ہیں جن میں ہندوستانی کسی طرح یورپینوں سے کم نہیں بلکہ بعض اوقات وہ اُن سے سبقت لے جاتے ہیں۔ لہذا اس بارے میں کسی قسم کے اندیشہ کی ضرورت نہیں۔

سب سے پُر لطف اعتراض یہ ہے کہ دوسرے ممالک کی مثال مغالطہ انگیز ہے۔ ہندوستان کی حالت جداگانہ ہے۔ ہندوستان سلطنت برطانیہ کا جُز ہے اور باہمی اتحاد کا ذریعہ انگریزی زبان ہے۔ گویا معترض کے خیال میں ہندوستان کا تعلق سلطنت برطانیہ سے اُسی وقت تک قایم رہ سکتا ہے۔ جب تک کہ انگریزی زبان ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم ہے۔ اور گویا انگریزی زبان اُسی وقت آسکتی ہے جب کہ وہ تمام مضامین و علوم کی تحصیل کا ذریعہ ہو۔ زبان سیکھنے کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں۔ اس اعتراض کو ہماری بحث سے کوئی واسطہ نہیں۔ علاوہ اس کے یہ سب تعلقات عارضی ہیں۔ لیکن ہمارا تعلق ہماری زبان سے ایسا ہے جو نہ کبھی جدا ہو سکتا ہے نہ ٹوٹ سکتا ہے۔ یہ ہماری ہستی سے وابستہ ہے۔

ہم ڈاکٹر سر آر جی بھنڈار کر کو بوجہ اُن کے علم و فضل اور بزرگی کے نہایت قابل احترام سمجھتے ہیں لیکن ہمیں اُن کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ چوں کہ جو خیالات یونیورسٹی کی تعلیم سے ہندوستانیوں کو پہنچے ہیں وہ مغربی اور انگریزی ہیں، اور دیسی زبانیں ان خیالات کے ادا کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور نہ اُن میں ایسا لٹریچر پیدا ہوا ہے جو مغربی علوم کے مناسب ہو، لہذا انگریزی ہی ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان ہونی چاہیئے۔ کیا روس میں پیٹر اور کیتھرائن کے عہد میں نیز اس کے بعد مدّت دراز تک جو خیالات پہنچے تھے وہ مغربی نہ تھے؟ کیا جاپان میں جو خیالات اور علوم و فنون پہنچے وہ مغربی نہ تھے؟ کیا انھوں نے بھی ان خیالات و علوم کی تحصیل کا ذریعہ انگریزی یا کسی غیر زبان کو قرار دیا تھا۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم بدنصیب مغربی خیالات و علوم کو اپنی زبان میں تحصیل نہ کر سکیں۔ علم کسی کی میراث نہیں۔ دُنیا کے ہر باشندہ کو اس پر حق ہے۔ اور ہر زبان اُسے اپنے بندوں تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جاپان نے جب مغربی علوم و خیالات اپنی زبان میں منتقل کئے تو وہاں کوئی ایسی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی جو آدھا تیتر آدھا

بتیر ہوتی۔ پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ اگر دیسی زبان مجبوراً ہمارے سر مڑھ دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک نئی زبان پیدا ہو جائے جو آدھا تیتر آدھا بیٹر ہوگی۔ قرین صحت نہیں معلوم ہوتا۔ اوّل تو کسی خاص فن یا علم کے بعض الفاظ مستعار لینے سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہو سکتی، کیوں کہ ہر زبان کے اصول صرف و نحو طرز بیان اور محاورہ الگ ہوتا ہے، دوسرے اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے تو کم سے کم اس میں نصف کے شریک تو ہوں گے اور یہ اس سے بہتر ہے کہ جہاں ہمارا کچھ بھی حصہ نہ تھا اور ہم سرتا سر ایک غیر زبان کے محتاج تھے۔ اہلِ زبان جو صاحبِ ذوق ہیں کبھی اپنی زبان کو اس طرح خراب اور مسخ ہونے دیں گے۔ وہ اتنا سمجھتے ہیں کہ دوسری زبان سے کون سے الفاظ ہمیں مستعار لینے چاہئیں اور کون سے ہمیں خود بنانے چاہئیں۔ ڈاکٹر بھنڈارکر صاحب کا یہ خوف و ہراس وہم سے خالی نہیں۔

ڈاکٹر بھنڈارکر ہمارے ملک کے اُن بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے انگریزی حکومت کا آخری ابتدائی زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور اُس کے قبل کے حالات چشم دید لوگوں سے سُنے ہیں۔ اُس وقت ہمارا ملک پریشان حالی، طوائف الملوکی، بدنظمی، بے بسی اور بے سروسامانی میں مبتلا تھا۔ ایسی حالت میں انگریزوں کے جدید انتظامات اور طریقے، اُن کی حیرت انگیز اختراعات و ایجادات اور اُن کے پُرمغز اور وسیع علم ادب اور تہذیب کو دیکھ کر ایسے مرعوب ہوئے کہ وہ آخر وقت تک اپنے دل و دماغ سے اس رُعب کو جدا نہ کر سکے اور جیسا کہ اس قسم کے علما کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص علمی ذوق میں اس قدر منہمک رہے کہ انھوں نے بعد کے حالات اور تغیرات کو کھلی آنکھوں اور بے لاگ دل سے نہیں دیکھا۔ نواب عماد الملک بہادر مدظلہ (مولوی سید حسین صاحب بلگرامی) کا شمار بھی انھیں بزرگوں میں ہے۔ لیکن وہ اس مسئلہ خاص میں اپنے تمام ہم عصروں سے منفرد ہیں۔ اس معاملہ میں انھیں اس قدر غلو ہے کہ وہ غیر زبان کے ذریعہ سے علم حاصل کرنے کو دماغی اور اخلاقی انحطاط کی علامت سمجھتے ہیں اور اُس جدید گروہ میں جو اپنی زبان کا حامی ہے نواب صاحب ممدوح باوجود کہن سال ہونے کے پیش پیش ہیں۔ اصطلاحات کا مسئلہ ایسا کٹھن ہے کہ جہاں پہنچ کر اکثر اصحاب (نئے ہوں یا پُرانے) ٹھٹک جاتے ہیں، انھوں نے اپنے عالمانہ مضمون میں (جو اس رسالہ کے پہلے نمبر میں شائع ہو چکا ہے) قطعی رائے کا اظہار فرمایا ہے اور جو رائے انھوں نے پچاس برس قبل قایم کی تھی اُس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی بلکہ

ترقی کی ہے۔ اُن کی یہ قطعی رائے ہے کہ جب تک ہم علوم اپنی زبان کے ذریعہ سے حاصل نہ کریں گے ملک علم سے بے بہرہ رہے گا اور کبھی علم کی اشاعت عام طور پر ملک میں نہ ہوگی۔ میں اب ملک کے ایسے واجب الاحترام بزرگ کی رائے نقل کرتا ہوں جو عالی دماغ مصنف اور بلند خیال شاعر ہونے کے علاوہ تعلیمی معاملات میں بھی استناد و اجتہاد کا درجہ رکھتا ہے اور جس نے دنیا اور خصوصاً اپنے وطن کے حالات کو نظرِ غائر سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور اس کے بہت بڑے حامی ہیں کہ انگریزی کی تعلیم بطور زبانِ دوم کے نہایت سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ اور کامل طور پر دی جائے۔ لیکن ذریعۂ تعلیم مدارس (نیز کالجوں میں یونیورسٹی کی ڈگری تک) مادری زبان ہو۔ وہ اس کی تائید میں چار دلیلیں پیش کرتے ہیں:-

اوّل۔ مادری زبان ہی کے ذریعہ سے ہر شخص زندگی کے اصلی سبق حاصل کرتا ہے۔

دوم۔ اس لئے کہ بعض طالب علم جو اعلیٰ تعلیم کا پورا استحقاق رکھتے ہیں انگریزی زبان پر بخوبی قادر نہیں ہو سکتے۔

سوم۔ اس لئے کہ بہت سے طالب علم جو انگریزی زبان حاصل کرتے ہیں اس میں پوری مہارت حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور تاہم اس زبان کی تحصیل کی کوشش میں جو بنگالی[۱] کے لئے بہت مشکل ہے وہ توانائی و ہمّت کا بہت بڑا حصّہ صرف کر دیتے ہیں، حالاں کہ قوت فکر و مشاہدہ کے آزادانہ نشو و نما کے لئے اس (توانائی و ہمّت) کی شدید ضرورت ہے۔

چہارم۔ اس لئے کہ مادری زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے میں لڑکیوں پر سے تعلیم کا بار ہلکا ہو جائیگا اور یہ اس لئے ضروری ہے کہ لڑکیوں کی صحیح اور اعلیٰ تربیت ہندوستان کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

اُن کی یہ رائے ہے کہ مغربی تہذیب کی خاص خاص اور اصل چیزیں تعلیم کی عام اشاعت کے ذریعے سے تمام بنگالیوں تک پہنچائی جائیں اور یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ دیسی زبان کے استعمال کو مدارس میں زیادہ تر رواج دیا جائے۔

---

[۱] جہاں کہیں بنگالی اور بنگال کے لفظ آئیں وہاں ہم بلا تکلف ہندوستانی اور ہندوستان کا تصوّر کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ حالات تقریباً تمام ملک میں یکساں ہیں (اڈیٹر)

انصاف کی بات یہ ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے دیسی زبانوں کے مسئلہ پر ایسی واضح اور مدلل بحث کی ہے کہ اب تک کسی سرکاری تحریر یا رپورٹ میں نہیں پائی گئی تھی۔ اس کمیشن نے دیسی زبانوں کی بڑی حمایت کی ہے اور اس کی ترقی اور توسیع کی پُر زور الفاظ میں ترغیب دی ہے۔ ذیل کے پرزور اور فصیح الفاظ سے کمیشن کی رائے کا بخوبی اظہار ہوتا ہے:-

"زبانوں کے ذریعہ سے جو مدرسہ میں حاصل کی جائیں یا بعد میں تعلیم یافتہ مرد یا عورت کے ہاتھ میں دنیا کی تہذیب وعلم کی کنجیاں آجاتی ہیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسا پروانہ راہداری آجاتا ہے جو اُسے اُن الفاظ تک پہنچا دیتا ہے جو تحریریں ہیں یا تقریریں ہیں اور حکما اور ادبا کی مجلس میں لیجاتا ہے جو زندہ ہیں یا مُردہ، قریب ہیں یا بعید۔ یورپ کے زمانہ وسطیٰ میں طالب علم کے لئے لاطینی علم کی کنجی تھی۔ اٹھارھویں صدی میں (یورپ میں) کاروبار و معاملات کے لئے فرانسیسی بڑی کنجی تھی۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگریزی ناگزیر ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ ہندوستانی طالب علم کے لئے انگریزی محض ذریعۂ معاش ہی نہیں، بلکہ اس سے زیادہ ہے۔ یہ ایک ایسا رستہ ہے جو اُسے وسیع علمی زندگی تک پہنچاتا ہے۔

لیکن دوسری طرف مادری زبان سب سے مقدم ہے۔ مادری زبان ہی فطری ذہانت کا صحیح آلہ ہے۔ ایک غیر زبان جو ذریعہ تعلیم ہے نئے خیالات کی رَو تو لاسکتی ہے۔ لیکن مادری زبان اُس آب وہوا میں ملی ہوئی ہے جس میں انسان پیدا ہوتا ہے۔ دیسی زبان ہی کے واسطہ سے (جو ذوق اور علم وفضل کے ذریعہ شایستہ ہوچکی ہے) انسانی دماغ کے جدید تخیلات تقریر میں شگوفے کی طرح کھلتے ہیں۔ یہ ایک عالمگیر صداقت ہے اگرچہ بعض شاذ ونادر مثالیں اس کے خلاف بھی ملتی ہیں، لیکن یہ مستثنیات عام قاعدہ کو اور واضح طور سے ثابت کرتی ہیں۔ انسان کی مادری زبان مثل اُس کے سایہ کے ہے جو اس کی ذات سے جدا نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنی زبان میں بموجب ایک پُرانی مثل کے خاص اپنے چشمے سے پانی پیتے ہیں۔ کیوں کہ ہم میں سے ہر ایک ایک جماعت کا رُکن ہے۔ ہم اس کی قوت اور فطری شعور اور پُرانی اور دُور کی چیزوں کی یادیں (خواہ وہ کتنی ہی مدھم ہوں) برابر کے شریک ہیں۔ یہ ہماری اپنی زبان یا عام بول چال ہی ہے

جس کے ذریعہ سے ہم اپنی فطرت کے مخصوص طرز ادا کو حاصل کر سکتے ہیں یا وہاں پہنچ سکتے ہیں جہاں تک کہ ہماری
فطرت رسائی کی اجازت دیتی ہے۔ یہ مادری زبان ہی ہے جو بچے کے دماغ کو تقریر کی روشنی سے منور کرتی اور
آسایش دیتی ہی جب کہ جسمانی تجربہ یا جذبات کی تحریک سے نئے خیالات اور رائیں احساس یا خیال کے
لفظ ناآشنا گوشوں میں سے ابھرتی ہیں اور وہ اُن کے ادا کرنے کے لئے الفاظ کی امداد ڈھونڈھتا ہی۔ لہذا
ہر نظام تعلیم میں مادری زبان کے آزادانہ اور صحیح استعمال کو سب سے پہلی جگہ دینی چاہیے۔"

اس خیال کے اظہار کے بعد انھوں نے تمام رایوں اور شہادتوں پر غور کرنے کے بعد یہ رائے قایم کی
ہی کہ میٹرکیولیشن کی جماعتوں میں انگریزی کا استعمال بحیثیت ذریعہ تعلیم کی ضرورت سے زیادہ ہی اور یہ طلبہ
کے حق میں مضرت رساں ہی۔ لہذا مدارس ثانویہ میں دیسی زبان باستثنا انگریزی اور ریاضی کے دوسرے
تمام مضامین کے لئے ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے۔ اس کے علاوہ امتحان میں طلبہ کو اجازت ہو کہ سوالات کے
جوابات خواہ وہ دیسی زبان میں دیں یا انگریزی میں (سوائے ریاضی اور انگریزی کے) مگر انٹرمیڈیٹ کالجوں
اور یونیورسٹی کے درجوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہونا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی انٹرمیڈیٹ کے درجوں
میں مادری زبان کی تعلیم نہایت ضروری ہی۔ اگرچہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہوگا لیکن سنسکرت
پالی اور خود دیسی زبانوں کی تعلیم میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہونے کی ضرورت نہیں۔

اصطلاحات علمیہ کے متعلق کمیشن کی یہ رائے ہی کہ انگریزی اصطلاحات بجنسہٖ اختیار کر لی جائیں۔ یہ خیال
صحت پر مبنی نہیں ہی کہ کسی لفظ کے سمجھنے کے لئے اس کی اصل و اشتقاق سے واقف ہونا ضروری ہے خود
انگریزی اصطلاحات لاطینی اور یونانی سے بنائی گئی ہیں، لیکن انگریزی لڑکے ایسے ہیں جو ان میں سے کوئی
زبان بھی نہیں جانتے۔ الفاظ اور اصطلاحات کے معنی عمل استعمال سے ذہن نشین ہوتے ہیں نہ کہ اصل زبان کے
مطالعہ سے۔ مثلاً سیاح "ٹیلسکوپ" کا لفظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں حالاں کہ وہ اس کے یونانی اشتقاق
و ترکیب سے بالکل ناواقف ہیں۔ ارکانِ کمیشن کی رائے میں اسما و صفات اور افعال کی گردانوں میں اور اُن سے
جو لفظ مشتق و مُرکّب ہوں گے اُن کے استعمال و رواج میں کوئی زیادہ دقت نہ ہوگی۔ کمیشن کی یہ بحث صرف طلبہ
کی کتب نصابِ تعلیم سے ہی کیوں کہ ان ہی طلبہ کو یونیورسٹی میں جا کر انگریزی اصطلاحات کا استعمال کرنا پڑیگا۔

اوران کے لئے دو زبانوں میں اصطلاحات یاد کرنا بیجا بار ہوگا۔

کمیشن نے مذکورہ بالا رائے موجودہ حالات کے رو سے قایم کی ہے اور درحقیقت ارکان کمیشن اس معاملہ میں ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ یہ امر اب مسلم ہے کہ مدارس ثانوی میں ذریعۂ تعلیم دیسی زبان ہونی چاہیئے لیکن امتحان کے معاملہ میں کمیشن نے کسی قدر کمزوری ظاہر کی ہے۔ ہماری رائے میں اس بات کو طلبہ کی مرضی پر چھوڑ دینا کہ خواہ وہ جوابات اپنی زبان میں دیں خواہ انگریزی میں درست نہیں۔ اس سے پھر دیسی زبان گھاٹے میں رہے گی۔ طلبہ باوجود اس اجازت کے حسب عادت انگریزی کا رواج قایم رکھیں گے اور فوراً اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اس راز کے سمجھنے میں انھیں ایک مدت لگے گی۔ اصولاً بھی یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ شاید ارکان کمیشن نے یہ رائے اس لئے دی ہے کہ بنگال میں ایک کثیر تعداد ایسے اشخاص کی موجود ہے جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ بنگالی اور اُردو دونوں میں جوابات دینے کی اجازت دیدیتے۔ جب تک انگریزی کا ذرا بھی لگاؤ رہے گا طالب علم حافظہ کے زور سے مضامین رٹ لیں گے اور اپنی زبان سمجھکر تحصیل کرنے سے غفلت کرتے رہیں گے۔ البتہ یہ شرط اس وقت کارگر نہیں ہوسکتی جب تمام کتب نصاب دیسی زبان میں ہوں اور پڑھانے والے بھی دیسی زبان ہی کے ذریعہ سے پڑھائیں دوسرا نقص اس تجویز میں یہ ہے کہ انھوں نے انگریزی اور ریاضی کو مستثنےٰ کر دیا ہے۔ حالاں کہ انگریزی کو خاص طور پر دیسی زبان کے ذریعہ سے پڑھانے کی ضرورت ہے جیسا کہ میں اس سے قبل لکھ چکا ہوں کہ اگر ابتداً انگریزی زبان کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے ہوتی تو انگریزی شعرا اور ادبا کے اعلیٰ خیالات بہت آسانی سے ہماری زبانوں میں منتقل ہوجاتے اور ہمیں ہر قسم کے نازک اور لطیف خیالات اور جذبات کے ادا کرنے میں زیادہ قدرت ہوتی اور ہماری زبانوں کے ادب کو بہت بڑا فائدہ پہنچتا۔ خیر ابتدا میں تو یہ عذر ہوسکتا تھا کہ دیسی زبانوں میں پڑھانے والے نہیں ملتے مگر یہ اب عذر پیش نہیں جاسکتا۔ ریاضی کی تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے اس لئے جائز رکھی گئی ہے کہ اس مضمون کی اعلیٰ تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے ہوگی اور طالب علم کو شروع سے انگریزی اصطلاحات سے مانوس رہنا چاہیئے۔ دوسرے ان کا یہ خیال بھی ہے کہ دیسی زبان میں ریاضی کی اصطلاحات نہیں ہیں۔ حساب کی ابتدائی تعلیم ظاہر ہے کہ طالب علموں کو اپنی زبان میں دی جائیگی

اوپر کے درجوں میں الجبرے اور علم ہندسہ کا اور اضافہ ہوگا۔ ان فنوں کے اصطلاحات دیسی زبانوں میں بھی موجود ہیں۔ اگر یہ خیال ہو کہ یونیورسٹی میں جا کر ریاضی انگریزی میں پڑھائی جائے گی تو یہ ہو سکتا ہے کہ مدارس ثانویہ میں طلبہ دیسی اور انگریزی دونوں اصطلاحات کو پیشِ نظر رکھیں۔ اور یہ کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اس کے علاوہ کمیشن کی یہ بھی رائے ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالجوں میں دیسی زبانوں کی تعلیم جاری رکھی جائے اور ان زبانوں کا عمدہ کلام طالب علموں کو پڑھایا جائے جس سے انھیں نہ صرف اپنی زبان پر قدرت حاصل ہوگی بلکہ صحیح طور سے غور کرنے اور اپنے خیالات کے بوجہ احسن ظاہر کرنے کی قوت پیدا ہوگی۔ اسی طرح یونیورسٹی درجوں میں بھی دیسی زبانوں کی ادبی تاریخی تنقیدی تعلیم کی رائے دی ہے تاکہ طلبہ اپنی زبانوں میں تحقیق و تنقید کا کام کر سکیں۔ کلکتہ یونیورسٹی نے اس سے قبل ہی اس کام کو شروع کر دیا تھا۔ جس کی مختصر کیفیت ڈاکٹر دنیش چندر سین نے اپنے مضمون میں بیان کی ہے جو اسی رسالہ میں شائع ہوا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں بھی دیسی زبانوں کی ترقی و توسیع کا خیال کریں گی۔

سب سے بڑا کام اس وقت یونیورسٹیوں کا یہ ہے کہ وہ اس قسم کی مجلسیں قائم کریں جو دیسی زبانوں کی ترقی کے متعلق غور کریں۔ مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھوائیں یا ترجمہ کرائیں تاکہ یہ اعتراض کہ دیسی زبانوں میں علمی کتابیں نہیں ہیں رفع ہو جائے اور جو لوگ محض اس وجہ سے دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے میں تامل کرتے ہیں، انھیں کوئی عذر نہ رہے۔

اگرچہ کمیشن نے آیندہ کے متعلق کسی رائے کے اظہار سے احتراز کیا ہے اور اس مسئلہ کو خود اہلِ ملک کے فیصلہ پر چھوڑ دیا ہے۔ تاہم اُن کا خیال یہ ہے کہ مثل بعض مقبوضات برطانیہ اور دیگر ممالک کے ہندوستان کو بھی دو زبانیں اختیار کرنی پڑیں گی۔ ایک اپنی زبان اُن عزیز چیزوں کے اظہار کے لئے جو بچپن سے اُن کی زندگی کا جز ہو گئی ہیں اور جو اُن کی شاعری اور قومی جذبات کی رُوح رواں ہیں۔ دوسرے انگریزی جو ہندوستان کے اتحاد، اور دوسرے ممالک سے تعلقات قائم رکھنے کے لئے باہمی تبادلۂ خیالات اور صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو ملک کی عام اور مشترک

زبان ہو سکے ؟ انگریزی باوجود اس ترقی کے جو اسے حاصل ہی اور باوجود اس شغف کے جو اہلِ ہند کو اس سے ہی ملک کی عام زبان نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمیشہ تعلیم یافتہ حلقے میں محدود رہے گی۔ نامور مستشرق ولسن کا وہ قول جو انھوں نے سرکاری فیصلہ کے خلاف لکھا تھا اب بھی باوجود انگریزی کی اس قدر اشاعت کے صحیح معلوم ہوتا ہی وہ لکھتے ہیں "اس کلیہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہی کہ قومی ادب (لٹریچر) صرف قومی زبان کے ساتھ ساتھ چل سکتا ہی۔ اور جب تک علم غیر زبان تک محدود رہے گا وہ صرف چندے اشخاص کی ملک ہو سکتا ہی جنھیں اس کی تحصیل کا موقع اور فرصت ہی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک ایسی زبان جو ہندوستانی زبان سے بالکل مختلف ہی کبھی عام طور پر ذریعۂ تعلیم نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اس کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر بھی انتظام کیا جائے تو بھی وہ صرف ایک فرقہ کا حصّہ ہو گی سارے ملک کی زبان نہیں ہو سکتی۔"

یہ حیثیت ہندوستان کی صرف دو زبانوں کو حاصل ہو سکتی ہی۔ ایک ہندی دوسرے ہندوستانی یا اُردو کو۔ اگرچہ بدنصیبی سے باہمی اختلافات نے ان دو زبانوں کو بالکل ایک دوسرے سے جُدا کر دیا ہی۔ لیکن حقیقت میں ہیں وہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ فریقین نے اپنی اپنی زبان کی حمایت میں جو اختلاف بیان کیا ہی اصل میں اس قدر اختلاف نہیں ہی۔ بڑا فرق رسم الخط کا ہی۔ اس کے متعلق بھی ہر فریق نے دلائل و براہین پیش کرکے اپنے اپنے خط کی خوبیاں اور دوسرے کی بُرائیاں دکھانے میں بڑا زور لگایا ہے۔ ہم یہاں ان کا اعادہ کرکے اس اختلاف کو تازہ نہیں کرنا چاہتے اور صرف ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو پروفیسر کی رائے بیان کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ چوں کہ فاضل پروفیسر کسی فریق سے تعلق نہیں رکھتے اور جنوبی ہند کے رہنے والے ہیں اور ملک کے تعلیمی مسائل پر اُن کی غائر نظر ہی، لہٰذا اُن کی رائے زیادہ قابلِ لحاظ اور لایقِ التفات ہے

"اگر اس ناممکن مفروضہ سے قطع نظر کر لیا جائے کہ انگریزی کسی زمانہ میں ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہو سکتی ہی تو اب صرف یہ امر باقی رہ جاتا ہی کہ یا تو ہم غیر مروجہ (مردہ) زبانوں میں سے جیسے سنسکرت پراکرت یا قدیم فارسی یا ہندوستان کی خاص خاص دیسی زبانوں میں سے مثلاً ہندی، بنگالی اور تامل میں سے کوئی زبان انتخاب کریں جو ملک کی عام زبان ہو۔ اوّل قسم کی زبانیں زیادہ بحث کے قابل نہیں۔ یہ سچ ہی کہ سنسکرت تمام ہندوستان میں پڑھی جاتی ہی علاوہ اس کے اس میں یہ خوبی بھی ہی کہ وہ تمام ہندوستانی

زبانوں کی بنیاد ہی۔ لیکن کسی زمانہ میں بھی وہ ہندوستان میں عام طور پر مُروّج نہ تھی اور یہ مشکل معلوم ہوتا ہی کہ ایک ایسی کامل زبان جس میں افعال کی اس قدر مختلف صورتیں ہیں عام لوگ بولتے ہوں۔ فارسی کا استحقاق اس معاملہ میں بہت کم ہی اور پراکرت کا اس سے بھی کم۔

اب صرف یہ بات باقی رہ گئی کہ ہندوستان میں چار بڑی بڑی زبانوں میں سے کون ایک مشترک زبان ہوسکتی ہی یعنی اس مسئلہ کی صورت صاف الفاظ میں یہ ہی کہ ہندستان کی خاص زبانوں میں سے ہم اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ معاشرت کے لئے کس زبان کو انتخاب کریں؟ بظاہر یہ جھگڑا ہندوستانی، بنگالی اور تامل میں ہی۔ تامل اور بنگالی، اگرچہ ان کا ادب وسیع ہی صرف ایک صوبہ اور خاص لوگوں میں محدود ہی۔ ہندوستانی کی حالت اس سے مختلف ہی۔ ہندوستانی بولنے والے کسی خاص محدود رقبے میں آباد نہیں۔ یہ زبان تمام شمالی ہند میں سمجھی جاتی ہی۔ ہندوستان کے مسلمان کسی قدر اختلاف کے ساتھ اسے استعمال کرتے ہیں اور اس سے اس کا دعویٰ اور قوی ہو جاتا ہی۔ علاوہ اس کے اس کے لکھنے میں دو قسم کے حروف استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ امر اس کے لئے باعث ضعف نہیں بلکہ اس کے استحقاق میں اور قوت پیدا کرتا ہی۔ ناگری حروف کی وجہ سے یہ تمام ہندوؤں میں مقبول ہی اور فارسی حروف کی وجہ سے تمام مسلمانوں میں۔ اس طرح ہندوستانی کو عام اور مشترک زبان قبول کر لینے سے ہماری تہذیب و تمدن کا سلسلہ ہندو مسلمان دونوں کے لئے قایم رہے گا۔[1]"

یہ اندیشہ بے بنیاد ہی کہ ہندوستانی کو عام اور مشترک زبان بنا لینے سے دوسری زبانوں کو نقصان پہنچے گا۔ ہر زبان اپنے اپنے صوبہ میں ترقی کرے گی اور اہلِ زبان کو ترقی پر وہی فخر ہوگا جو اس وقت ہی۔ ہندوستانی پہلے ہی سے ملک کے اکثر حصّوں میں بولی یا سمجھی جاتی ہی اور ہر جگہ مقبول نظر آتی ہی اس سیکھنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی۔ یہ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہی کہ یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور اہلِ ملک کو دو یا تین زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں اگرچہ اس سے دماغ پر بار پڑتا ہی لیکن ساتھ ہی دوسرے فوائد بھی مدِنظر ہیں۔

[1] منظم تعلیم ہندوستان (Essays on Educational Reconstruction in India. مؤلفہ پروفیسر کے ایم پانیکر

جن کے بغیر چارہ نہیں۔ ہندوستان ہی ایک ایسا ملک نہیں بلکہ دنیا میں اور بھی ایسے ممالک ہیں جہاں حالات کے لحاظ سے یہی دقت پیش آتی ہی اور وہاں والوں کو دو دو زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ مثلاً ویلز کے طالب علم جب انگلینڈ کی کسی یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں انگریزی بولنی پڑتی ہے۔ بلجیم اور سوئزرلینڈ ایسے ملک ہیں جہاں کے باشندوں کو دو دو اور بعض اوقات تین تین زبانوں کا جاننا ضروری ہوتا ہی اس سے اُن کی تعلیم یا ذہنی ترقی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی طرح فنلینڈ میں سویڈش اور فنش یا گرین لینڈ میں ڈینش اور اسکیمو یا جاوا میں ڈچ یا ملائی زبانیں جاننی اور بولنی پڑتی ہیں۔ اہلِ ہند کے لئے موجودہ حالات میں اس کے بغیر چارہ نہیں کہ وہ اپنی مادری زبان کے علاوہ ہندوستانی جانیں اور بولیں اور علمی ترقی اور ذہنی نشوونما کے لئے انگریزی یا کوئی اور یورپی زبان سیکھیں۔ قوموں کو دنیا میں ترقی کرنے کے لئے بہت سی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں ان میں سے ایک قربانی یہ بھی ہی جو ہمارے ملک کے حالات نے ہم پر فرض کر دی ہی۔

اصطلاحات نباتات

از جناب مولوی سید وحید الدین سلیم پروفیسر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ نمبر پنجم جلد ۲ بابت ماہ جنوری سنہ رواں)

Boronia	بورونیہ
Bostryx	کاکلیہ
Botanical	نباتی
Botanic garden	نباتی باغ (نباتستان)
Botanist	نبات داں
Botany	نباتیات - نباتات
Botrychium	خوشیہ
Botryoidal	خوشیلا
Botryose	خوشہ نما
Botryosporium	خوشہ دانہ
Boussingaultia	بوسنگولطیہ
Bouteloua	بوطیلویہ
Bouvardia	بووردیہ
Bowdichia	بودیشیہ
Brabeium	عطیہ
Bradburya	براڈبریہ

Butneria	بٹنیریہ
Butomaceoe	بطموسائیلہ
Butomaceous	بطموسائیلی
Butomus	بطموس
Butea	بوٹیہ
Buxbaumia	بکسومیہ - بکسبومیہ
Carpel	ثمیرہ - برچہ
Carpellary	ثمیری - برچکی
Carpellate	ثمیردار - برچہ دار
Caulescent	ساقدار - تنہ دار
Chloranthaceoe	سبزولائیلہ
Chloranthacious	سبزولائیلی
Chloranthus	سبزولیہ
Chloranthy	سبزولیت
Decagynia	دہ زنہ
Decagynian	دہ زنی

33	Dermatogen	جلد افرين
34	Diadelphia	دوبرادر
35	Diadelphous	دوبرادري
36	Epicalyx	زيركاس
37	Epicarp	زيربار-زيربهل
38	Faba	لوبيا
39	Fabaceoe	لوبايله
40	Febaceous	لوبايلي
41	Fagelia	فاجيليه
42	Falcata	هنسيا
43	Fiber, Fibre	ريشه-ليف
44	Fibered, Fibred	ريشه‌دار-ليف‌دار
45	Fiber, or Fibre, plant	ريشه داردرخت
46	Fibril	ريشك-ليفك
47	Fibrillar	ريشكي-ليفكي
48		ريشكدار-ليفكدار
49	Fibrillary	ريشيكت-ليفيكيت
50	Fibration	ليفان
51	Fibriform	ليف‌مان
52	Fibrilliform	ليفك‌مان
53	Galactia	اشيريه
54	Gasteromycetes	شكم كهربي
55	Gastrolobium	شكم دمه
56	Geoffroea	جاوريه
57	Geoglossum	ارضبان
58	Germpore	جرسام
59	Germtube	جرمي نلي-جرم نلي
60	Gladiate	خنجراسا
61	Gladiole	خنجره
62	Glabularia	كرويه
63	Globulariaceoe	كروايله
64	Glochidiate	ديكاني
65	Glochidium	ديكان
66	Glossopteris	زبان سرخس
67	Glossopodium	زبان پايه
68	Hobenaria	تسميلا
69	Hadrocentric	مث بيچا
70	Hoemanthus	دم گله
71	Hoematoxylon	دم عوديه - بقم
72	Hoemodoraceoe	دم بنايله

73	Hokea	هاکیه
74	Halleria	هالریه
75	Halophilous	نونچه
76	Haloragidaceoe	یمکنارایله
77	Haloragidaceous	یمکناری
78	Hylophyte	شوریا
79	Hamelia	هاملیه
80	Hepatica	جگرانه
81	Hepaticoe	جگریه
82	Hygrophyte	نم رو – نم نبات
83	Hygrophytic	نم روئی
84	Hymeniferous	جهل پرت
85	Hymenium	جهلی
86	Hymenocallis	جهل روپ
87	Hymenophore	جهلی دار
88	Hymenophyllaceoe	جهل پتیے
89	Hymenophyllum	جهل پتیا
90	Hyoscyamus	بنج (اجواین خراسانی)
91	Hypanthium	زیر گل
92	Hypanthial	زیر گلی
93	Hypodermal	زیرجلد
94	Jaborandi	جابورندی
95	Jacaranda	جکارندا
96	Jacitrra palm	جاسی تارا
97	Jacksonia	جکسونیه
98	Jacobinia	یعقوبیه
99	Jagua palm	جگوا
100	Kittul	کی تول
101	Kneffia	نیفیه
102	Kniphofia	نفرفیه
103	Kochia	کوکیه
104	Koeberlinia	کوبرلینیه
105	Koelreuteria	کلروتیریه
106	Kokoona	کوکونا
107	Kosteletzkya	کوسی لزکیه
108	Krameria	کرامیریه
109	Labellum	لبک
110	Labiate	لبلا
111	Laboulceniaceoe	لابول بنایله
112	Laboulbeniales	لابول بنایلی – لابول بنیلی

No.	English	Persian
113	Laboulbeniaceous	لابول بنیله
[illegible]	Lachenalia	لاکي نبليه
115	Lactarius	دودهيا
116	Lactoric	شيرلا
117	Lactoridaceoe	شيرلايله
118	Lactoridaceous	شيرلايلي
[illegible]	Lactiflorous	شيرگله
[illegible]	Loelia	ايليه
[illegible]	Lagerstroemia	ليگرستيميه
122	Laminaria	صفيحيه
123	Laminariaceoe	صفيحايله
124	Laminariaceaus	صفيحايلي
125	Lanceolate	برچهيلا
126	Lancepod	نيز پايه
127	Langsdorffia	لنزدرفيه
128	Lantana	كوپلا
129	Lapageria	لاپا جيريه
130	Lapeyrousia	لاپا روزيه
131	Maranta	مرنتا
132	Mycelioid	نطرو ما سا
133	Mycelium	نطرومه
134	Mycelial	فطرومي
135	Mycetoid	فطراسا
136	Mycoplasma	فطري قالب
137	Mycology	فطريات
138	Mycologic	طرياتي
139	Mycologist	نظريات دان
140	Mycorrhiza	فطري بن
[illegible]	Mycorrhizal	فطريبني
142	Myoporaceoe	نفطايله
143	Myoporaceous	نفطايلي
144	Myoporum	نفطيه
145	Myrcia	آس
146	Octogynia	هشتماده
147	Octogynian	هشتمادي
148	Octolocular	هشتخانک
149	Octophyllous	هشبر گوله
150	Odontoglossum	دنتاجيبيا
151	Oedogonium	ورميج
152	Oenanthe	تاک

Oenocarpus	ناکبر
Olea	زیتون
Oleaceoe	زیتونایله
Oleaceous	زیتونایلی
Oligocarpous	کمبر
Olive	زیتون
Oligospermous	کم تخمه
Oligotaxy	کم نظامی - کم ترتیبی
Ombrophile	باران جو
Ombrophobe	باران گریز
Periderm	حول جلد
Peridermal	حول جلدی
Perisperm	حول بزره
Perispermal / Perispermic	حول بزری
Porphyritic	ادعرانیه
Sabbatia	سباتیه
Sabia	سابیه
Sabiaceoe	سابایله
Sabiaceous	سابایلی
Sac	کیسه
Saccharomyces	شکر کهمبی
Saccharomycetaceoe	شکر کهمبایله
Saccharomycetaceous	شکر کهمبا یلی
Saffron	زعفران
Sageretia	سکریشیه
Sagina	سمینه
Sagittaria	سهمیه
Saguerus	ساگرئیه
Salicaceoe	صفصایله-صفصافایله
Salicaceous	صفصایلی
Salicornia	نمکهار
Salix	صفصاف
Salomonia	سالمونیه
Salpiglossis	سرنازبان
Salvadora	سلوا دورا
Salvadoraceoe	سلوا دورایله
Salvadoraceous	سلوا دورایلی
Salvia	سلویه
Salvinia	سلوینیه
Salviniaceoe	سلوینایله

No.	Term	Ottoman
193	Salviniaceous	سالوينايلي
194	Samandura	سمندره
195	Sanguisorba	لهو چوس
196	Sanicle	شافى
197	Sanicula	شافيه
198	Santalaceoe	صندلايله
199	Santalaceous	صندلايلي
200	Santalales	صندليله
201	Santalum	صندل
202	Sanvitalia	سنوطاليه
203	Sapindaceoe	صابونايله
204	Sapindaceous	صابونايلي
205	Sapindales	صابونيله
206	Sapindus	صابونغديه
207	Sapodilla	سبيطيه
208	Saponaria	صابونيه
209	Sapota	سابوطه
210	Sapotaceoe	سابوطايله
211	Sapotaceous	سابوطايلي



تبصرے

سوانح عمری۔ نواب مولوی تفضل حسین خاں خان علاّمہ	ازاڈیٹر
حزن اختر	
اسلام کا اثر یورپ پر	
جواہر منظوم ۔ ترجمہ رباعیات سرمد	
نقاش	
نگار	
دی ٹیچر	
رئیس ہند	

سوانح عمری نواب مولوی تفضل حسین خاں خانِ علاّمہ

اگرچہ ایک سو پندرہ برس ہوتے ہیں کہ ایشیاٹک سوسائٹی نے خان علاّمہ کے حالات شائع کئے تھے مگر ہمارے ملک میں کتنے صاحب ہیں جو علاّمہ مرحوم کے نام اور اُن کے کارناموں سے واقف ہیں ۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اُن کے سعید اور قابل پوتے نواب سید محمد علی خاں صاحب نے مختلف تواریخ نیز

اپنے اور اپنے خاندان کی معلومات کی مدد سے خان علامہ کی ایک مختصر سوانح عمری اردو میں شائع کی ہے
اس میں جناب نوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی بھی قابل شکریہ ہیں کہ اُن کی تحریک سے وہ اس کے لکھنے
اور شائع کرنے پر آمادہ ہوئے۔

خان علاّمہ ہندوستان کے اسلامی عہد کے آخری دور میں ایک بے نظیر فاضل اور عالم متبحر گذرے ہیں
اُن کے بزرگ تاتار سے آکر کشمیر میں بس گئے تھے۔ اور پھر تجارت کے سلسلہ میں لاہور پہنچے جہاں اُنھوں نے صوبہ دار
لاہور کی ملازمت اختیار کر لی۔ خان علاّمہ سیالکوٹ (اور بقول بعض لاہور) میں ۱۱۵۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ لیکن
تیرہ سال ہی کی عمر میں دھلی چلے آئے جہاں اُن کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ انیس[19] سال کی عمر میں لکھنؤ آئے اور
ملاّ حسن صاحب فرنگی محلی کی خدمت میں تکمیل علوم شروع کی۔ چونکہ خان مرحوم بلا کے ذہین تھے اور بعض اوقات
ایسے نازک اعتراضات کر بیٹھتے تھے کہ ملاّ صاحب کو اُن کا جواب دینا مشکل ہو جاتا تھا۔ اسلئے ملاّ صاحب نے
ایک بار ان کی غیر معمولی ذہانت اور طلاقت زبانی دیکھ کے جھنجلا کر کتاب زمین پر دے ماری اور کہا اب تم کو
پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد سے اُنھوں نے درسگاہ میں جانا ترک کر دیا اور خود ہی کتب بینی اور مطالعہ
میں مصروف رہے۔ اور ساتھ ہی درس تدریس کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کے علم و فضل
کا اس قدر شہرہ ہوا کہ نواب شجاع الدولہ بہادر نے انھیں اپنے فرزند سعادت علی خاں کا اتالیق مقرر کر دیا۔

نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ زیب دہ مسند وزارت ہوئے۔ تھوڑے ہی
عرصہ کے بعد بعض حالات کی وجہ سے دونوں بھائیوں میں ناچاقی ہوگئی اور کشیدگی یہانتک بڑھی کہ گورنر جنرل
(ہیسٹنگز) کو دخل دینا پڑا۔ مصالحت کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ نواب سعادت علی خاں خان علاّمہ
کو اپنی خدمت سے علیحدہ کر دیں۔ نواب سعادت علی خاں اس شرط کو منظور نہیں کرتے تھے مگر خان علاّمہ خود اصرار
کر کے علیحدہ ہو گئے۔ گورنر جنرل کو جب ان کی ایثار نفسی کا حال معلوم ہوا تو اُن پر اس کا بہت اثر پڑا اور خان علاّمہ
کو پانسو روپیہ ماہوار پر میجر پامر کا مددگار مقرر کر دیا۔ میجر موصوف اُس زمانہ میں رانا گوہار سے ملکی معاملات کی متعلق

کارروائی کررہے تھے ۔ ان معاملات میں خان علاّمہ نے اس قابلیت سے کام کیا کہ گورنر جنرل نے اُنھیں ایک دوسری اہم ذمہ داری کی خدمت پر مقرر کیا یعنی مسٹر ڈیوڈ انڈرسن سفیر کامل الاختیار کے ساتھ اُنھیں مادھوجی سندھیا سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا ۔ وہاں انھوں نے ان ملکی معاملات میں ایسی ذہانت اور لیاقت دکھائی کہ ڈیوڈ انڈرسن ان کے قائل ہوگئے ۔ ڈیوڈ انڈرسن اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میں ہندوستان میں بہت سے ہندوستانیوں سے ملا ہوں مگر میں نے کسی میں اس قدر صفات بدرجۂ کامل جمع نہیں دیکھیں کہ جو ایسا اعلیٰ درجہ کا معاملہ فہم ۔ ایسا عالم متبحر ، ایسا روشن خیال اور خوش اخلاق ہو ۔

اُسی زمانہ میں جبکہ وہ مسٹر ڈیوڈ انڈرسن کے ساتھ کیمپ میں تھے ۔ اُنھوں نے انگریزی زبان کی تحصیل شروع کردی جس میں مسٹر انڈرسن کے بھائی نے بہت مدد دی ۔ بعد میں مطالعہ سے اُنھوں نے انگریزی کی بہت اچھی قابلیت حاصل کرلی ۔

اُنھیں دنوں میں ایک دن تذکرہ تذکرہ میں پیشوا کی زبان سے بعض کلمات نواب آصف الدولہ بہادر کی شان کے خلاف نکل گئے ۔ خان علاّمہ کو یہ ناگوار گذرا اور اُنھوں نے بڑی خوبی سے اس کی وہیں تردید کردی ۔ نواب کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے چنانچہ جب خان علاّمہ لکھنؤ آئے تو نواب نے انھیں عہدۂ سفارت پر مقرر کرکے کلکتہ بھیجدیا ۔ اس عہدۂ سفارت پر رہ کر اُنھوں نے بہت قابل تحسین خدمات انجام دیں جس سے نواب کی نظروں میں اُن کی بڑی وقعت ہوگئی ۔

ایک ایسی ہی قابل تعریف کارگذاری کے صلہ میں نواب آمیرالدولہ بہادر انھیں اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے لیکن امیرالدولہ بہادر کے دفعتہً انتقال کرجانے سے وہ پھر واپس کلکتہ چلے آئے ۔

نواب امیرالدولہ بہادر کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ راجہ ٹکیٹ رائے سے ناراض ہوگئے اور نائب الریاست بھی معتوب ہوئے ۔ کام میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہونے لگیں ۔ سرجان شور گورنر جنرل نے بہت سمجھایا کہ کوئی نائب مقرر ہونا چاہیئے ورنہ ریاست کا کاروبار ابتر ہوجائیگا ۔ مگر جس کسی کا نام پیش کیا جاتا تھا وہ منظور نہیں کرتے تھے

آخر جب یہ کہا گیا کہ جسے آپ مناسب سمجھیں مقرر فرمائیں تو فرمایا کہ تفضل حسین خاں سے بہتر کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ گورنر جنرل نے کہا کہ خان علّامہ ایک مسئلہ حکمیہ کے حل کرنے کو حکومت اقلیم ہند سے بہتر سمجھتے ہیں۔ نواب نے کہا کہ آپ خان علّامہ کو میرے پاس بھیجدیجئے میں راضی کر لونگا۔ لکھا ہی کہ جب خان علّامہ حاضر ہوئے تو نواب آصف الدولہ نے اُن کی گردن میں ہاتھ ڈالدئے کہ "میری آبرو اب تمھارے اس امر کے قبول کرنے پر ہے۔ اگر تمھیں میرے نمک کا پاس ہی تو اس سے انکار نہ کرو" ایسی حالت میں کیا انکار کر سکتے تھے۔ فوراً خلعت نیابت سی سرفراز ہوئے۔

ایسے دربار میں بھلا ایسے صاحب علم اور نیک نفس شخص کا کیا کام تھا۔ وہاں کے حالات اور صحبت سی بہت گھبرائے۔ نواب آصف الدولہ کی داد دہش مشہور ہے اُن کی بے دریغ بخششوں نے خزانہ خالی کر دیا تھا۔ نا اہلوں اور خود غرضوں کا مجمع تھا۔ ایسے حالات میں انتظام کرنا یا اصلاح کا خیال کرنا عبث ہی۔ کچھ دنوں بعد نواب آصف الدولہ کا انتقال ہوگیا تو وزیر علی خاں مسند نشین ہوئے اُن کی تلون مزاجی اور نالایقیوں نے دربار کا رنگ اور بگاڑ دیا نوبت یہانتک پہنچی کہ حکومت سے علیحدہ کئے گئے۔ اور نواب سعادت علی خاں سریر آرائے حکومت ہوئے اور خان علامہ اپنی سابق خدمت سفارت پر واپس کلکتہ چلے گئے۔

سفارت کے زمانہ میں انہیں مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا خوب موقع ملا۔ تحفۃ العالم میں اُن کے روزانہ اوقات کی یوں کیفیت لکھی ہی کہ "دن چڑھے سو کر اُٹھتے تھے۔ اُس وقت ریاضی کے طالب علم اُن سے استفادہ کرتے تھے قریب ظہر انگریزوں کی ملاقات اور کار منصبی کے ادا کرنے میں مشغول ہوجاتے۔ پھر لوگ ملنے کے لئے آجاتے کبھی کبھی خود بھی جاتے تھے۔ عصر کے وقت بعض طالب علم فقہ امامیہ پڑھتے۔ پھر نماز ظہرین ادا کرتے اور کھانا کھاتے۔ اس کے بعد کچھ طالب علم فقہ حنفیہ کا درس لینے حاضر ہوتے۔ شام ہونے کے بعد نماز عشائین ادا کرتے۔ پھر تنہا کتب مطالعہ اور مسائل علمیہ کے غور و خوض میں مصروف ہو جاتے۔ یہانتک کہ صبح کی نماز کا وقت آجاتا۔ بعد نماز سو جاتے۔"

خان علامہ عربی۔ فارسی اور علوم اسلامی کے زبردست عالم تھے انگریزی میں بھی اُنھوں نے بہت اچھی لیاقت حاصل کرلی تھی۔ اس کے بعد اُنھوں نے لاطینی کا مطالعہ شروع کیا اور اُس میں کافی استعداد پیدا کرلی۔ آخر زمانہ میں اُنھیں

یونانی سیکھنے کا شوق ہوا اور اُس میں بھی بقدر ضرورت واقفیت بہم پہنچالی۔ انھیں علاوہ دیگر علوم کے ریاضی اور ہیئت سے بہت شوق تھا اور اسی خیال سے اُنھوں نے انگریزی اور لاطینی پڑھی اور یورپین محققین کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ مسٹر روبن بروز نے لارڈ سمتھ کو ایک خط میں خان علامہ کی تصانیف کے متعلق یہ لکھا ہے۔

" تفضل حسین خاں نیوٹن کی پرنسپیا (Principia) کا ترجمہ کر رہے ہیں اور ہم اُسے عربی میں شائع کرینگے۔ میرا ارادہ اس ترجمہ پر حواشی لکھنے کا ہے اس کے علاوہ انھوں نے امرسن کی میکانکس (Emerson's mechanices) اور الجبرا کا بھی عربی میں ترجمہ کیا ہے آج کل وہ اپالونی اَس (Appolonius de Sectione Rationis) کے ترجمہ میں مصروف ہیں۔ اس کتاب کی قسمت بھی عجیب ہے۔ یہ کتاب اوّل اوّل یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئی۔ اصل یونانی نسخہ مفقود ہوگیا۔ بعدازاں بوڈلین لائبریری کے عربی نسخے سے اس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ اس کا عربی نسخہ ایشیا میں کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ میں نے لاطینی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اور اب تفضل حسین خاں اس کا عربی میں ترجمہ کر رہے ہیں " اس کے علاوہ اُنھوں نے مخروطات سمن کے جبر و مقابلہ اور وارسن کے جرثقیل کا ترجمہ کیا۔ لوگارثم اور خط منحنی پر رسالے لکھے۔ نیز ابن ہیثم کے علم مناظر پر حاشیہ تحریر فرمایا۔

افسوس ہے کہ اس بے نظیر عالم کی کتابیں اب ہماری نظروں سے مفقود ہیں۔ بقول مؤلف سوانح عمری ممکن ہے کہ تلاش سے ایشیاٹک سوسائٹی میں اُن کے تراجم و تصانیف کا ذخیرہ دستیاب ہو جائے۔ درحقیقت خان علامہ کی زندگی سبق آموز اور اُن کے کارنامے قابل فخر ہیں۔

بارے دنیا میں رہو۔ غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

دائرۂ ادبیہ کی جدید مطبوعات

۱- حزن اختر
۲- اسلام کا اثر یورپ پر

حزن اختر اودہ کے آخری تاجدار سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر کی ایک مثنوی ہے جس میں شاہ مرحوم نے زمانۂ قید کلکتہ کے حالات اور مصائب تحریر فرمائے ہیں۔ بقول مولانا عبدالحلیم صاحب شرر "یوں تو یہ مثنوی ایک شاعرانہ کلام ہے۔ مگر دراصل شاہ جنت آرامگاہ کی " اٹوبیاگرفی" یعنی خود اپنی سوانح عمری کا ایک دردناک ٹکڑا ہے مولوی محبوب علی صاحب ناظم دائرہ ادبیہ قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس شاہ بیتی کو جو مرحوم بادشاہ نے اپنے خون جگر سے لکھی تھی گمنامی سے نکال کر عام طور پر شائع کر دیا۔

یہ مثنوی چھوٹی سی تقطیع پر بہت اچھی چھپی ہے۔ شروع میں مولانا شرر صاحب کا بہت دلچسپ مقدمہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا سے بہتر اس پر کوئی مقدمہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ کیونکہ مولانا نے اس مظلوم بادشاہ کی آخری شان اور مٹیا برج کی صحبتوں کے رنگ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ گو بادشاہ قید فرنگ میں تھے مگر اُن کے قدموں کی برکت سے مٹیا برج خود ایک نیا لکھنؤ بن گیا تھا اور سچ یہ ہے کہ لکھنؤ کا جسم تو اودھ میں تھا مگر اس کی جان مٹیا برج میں تھی وہی صحبتیں وہی جلسے وہی شعر و شاعری اور عمارت کا شوق وہی دربار اور تکلفات جو بادشاہی میں تھے اس قید فرنگ میں بھی نظر آتے تھے۔ کس قدر افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ لارڈ ڈفرن جیسے ہوش مند مدبر نے مٹیا برج کے تمام

---

۱ - حزن اختر - مجلد عصہ - غیر مجلد ۸ر
۲ - اسلام کا اثر یورپ پر - مجلد ۱۲ر غیر مجلد ۴ر

دائرہ ادبیہ لکھنؤ سے مل سکتی ہیں

عالیشان قصر و عمارات، وہاں کے دلفریب چمن، چڑیا گھر اور ڈیوڑھیاں گرا کر خاک میں ملا دیں ہم اسے کیا کہیں!
مگر خود انھیں کے ہم سر و ہم شعار فرمائیں کہ اِسے کیا کہتے ہیں؟

جب ۱۸۵۷ء کی مشہور فوجی شورش ہندوستان میں نمودار ہوئی تو انگریزوں کو اس اسیر بادشاہ پر بھی سازش کا شبہ ہوا۔ حالانکہ یہ اُن کے وظیفہ خوار تمام معاملات سے بے خبر وطن سے دور پڑے تھے مگر شبہ سے نہ بچ سکے۔ بادشاہ کچھ دنوں سے علیل تھے۔ علاج سے جب شفا پائی تو غسل صحت ہوا۔ مبارک بادی اور سلامتی کا غل ہونے لگا۔ شب کو بزم طرب جمی، ناچ گانا اور جلسہ رہا۔ چار گھڑی رات باقی تھی کہ جلسہ برخاست ہوا۔ سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے پہنچے جا کر سو رہے۔ ابھی بادشاہ آرام فرما رہے تھے کہ داد فریاد اور دہائی کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یکایک بادشاہ خواب راحت سے بیدار ہوئے تو معلوم ہوا کہ کوٹھی کو گورا فوج نے گھیر رکھا ہے۔ آخر گورنر جنرل کے سکرٹری آئے اور کہا کہ سرکار کو کچھ شبہ سا ہو گیا ہے۔ اسلئے یہ حکم ہوا ہے کہ آپ کچھ دنوں قلعہ میں قیام فرمائے۔ بادشاہ نے ہر چند اپنی بے گناہی ثابت کی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ صرف آٹھ مصاحبوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت دی گئی۔ نوکر چاکر سب ملا کر اکتیس آدمی ہمراہ گئے۔ قلعہ (فورٹ ولیم) کا جو قلی دروازہ تھا وہاں ان سب کو پہنچا دیا۔ آٹھ روز تک وہاں رہے بعد ازاں قلعہ میں جو کوٹھی تھی وہاں قیام کا انتظام کیا گیا۔ یہ مثنوی اسی قید کا رونا ہے۔ وہاں جو جو بیتی یہ اُس کا کچّا حال ہے۔ بادشاہ کو اپنی بیگمات کی جدائی کا بڑا قلق تھا۔ پھر اُس پر بعض مصاحبوں اور بیگموں کی بیوفائی، ملازموں کی شوخ چشمی اور شورہ پشتی، پہرہ کے گوروں کی بدسلوکی اور طرح طرح کی تکلیفوں نے زندگی تلخ کر دی تھی۔ غرض اُس زمانہ کی پوری کیفیت اس میں درج ہے۔

نظم سیدھی سادی ہے اور اُن تکلفات سے بری ہے جو اُس وقت لکھنؤ کی شاعری میں عام طور سے پائے جاتے تھے اپنے دلی جذبات اور حالات کو بے تکلف بیان کر دیا ہے۔ یہ بات کچھ چھپی ہوئی نہیں کہ واجد علی شاہ کو ادب و شاعری کا ذوق تھا۔ لیکن بادشاہوں کا جیسا کچھ ذوق ہوتا ہے وہ بھی معلوم ہے۔ مولانا شرر نے اپنے مقدمہ میں اس معاملہ کو صاف کر دیا ہے۔ اور بہت خوبی سے یہ ثابت کیا ہے کہ "واجد علی شاہ کا کلام بُرا بھلا جو کچھ ہے خاص اُن کا ہے۔ اس میں ایک حرف بھی کسی اور کا نہیں ہے۔" اسی ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ "اصلی خرابی یہ تھی کہ بادشاہ کبھی کسی سے اصلاح یا مشورہ

نہ لیتے۔ تعلیم واصلاح کا زمانہ لکھنؤ ہی میں ختم ہوگیا تھا۔ مٹیا برج میں وہ اُستاد بلکہ اُستاد الکل تھے۔ ذہن میں یہ جمی ہوئی تھی کہ کلام الملوک ملوک الکلام۔ جتنے شعرا و اساتذہ ملازم تھے۔ سب شاگرد سمجھے جاتے، وہ شرف شاگردی حاصل کرنے کی درخواست کرتے۔ بہ عنایت شاہی یہ عزّت اُن کو دی جاتی اور ایک مہر عطا ہوتی جس میں نام و خطاب کے ساتھ الفاظ "تلمیذ السلطان" بھی کندہ ہوتے .... یہی اُستادی کلام میں لغزشوں کے رہ جانے کا باعث ہوتی۔ اور قیامت یہ تھی کہ دربار والے چاہے کتنے ہی صاحب کمال شاعر ہوں بجائے تنبیہ کرنے کے لغزشوں پر بجید داد دیتے، لیکن اور جس قسم کی لغزش چاہے ہوجائے یہ ممکن نہ تھا کہ کبھی کوئی مصرعہ غیر موزوں رہ جائے یا بحر سے الگ ہو اور یہ اُن کی کمال موزونی طبع کی دلیل ہے۔"

مولانا کی یہ رائے بالکل درست ہے جس کا ثبوت اس مثنوی کے مطالعہ سے بھی ملتا ہے۔ گو اس مثنوی کا درجہ بلحاظ شاعری کے اعلیٰ نہ ہو مگر ایسی یادگار ہے جو ہم اہل ہند کو نہایت عزیز ہے اور علاوہ شاعری کے تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے اور اُس زمانہ کو یاد دلاتی ہے جو ہمارے اخلاقی سیاسی زوال کا کمال تھا۔

اِسلام کا اثر یُورپ پر یہ رسالہ بھی اُسی تقطیع پر چھپا ہے جو حزن اختر کی ہے اس میں قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی نے یورپی مصنفین اور مورخین کے اقوال جمع کردئے ہیں جن سے کامل طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تمدّن اور علوم و فنون کا یورپ پر کیسا کچھ اثر ہوا۔ اور کہاں تک وہ اس سے متمتع ہوئے۔ آخر میں ایک فہرست مسلمان مصنفین نیز اُن کی اُن تصنیفات کی دی ہے جن کا ترجمہ یورپ کی کسی زبان میں ہوا ہے۔ اگرچہ یہ مختصر سی کتاب ہے۔ لیکن اس میں کافی معلومات جمع کردئے گئے ہیں۔ مؤلف نے اس کے ترجمہ و ترتیب میں محنت کی ہے جن اصحاب کو اس مضمون سے دلچسپی ہے وہ اسے بہت کارآمد پائینگے۔

جواہرِ منظوم

ترجمۂ اردو

رباعیاتِ سرمد

رباعیات سرمد کا یہ منظوم ترجمہ منشی سید نواب علی صاحب صَولت لکھنوی کا کیا ہوا ہی اور شاہجہانی پریس دہلی میں چھپا ہی۔ شروع میں سرمد کی سوانح عمری درج ہی جو مولانا ابوالکلام آزاد کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ مولانا کی یہ شکایت بجا معلوم ہوتی ہی کہ ہمعصر مؤرّخوں نے کہیں سرمد کا ذکر نہیں کیا حالانکہ دورازکار اور فضول قصّوں سے صفحے کے صفحے رنگ دیے ہیں۔ اُن کا خیال ہی کہ مؤرّخین نے پوری مستعدی کے ساتھ اس امر کی احتیاط کی ہی کہ سرمد کا ذکر نہ آنے پائے۔ اور یہ سیاسی عیاری اور چالبازی تھی تاکہ اُن کے آقائے ولی نعمت (عالمگیر) کے دامن پر اس خونِ ناحق کی چھینٹ نہ پڑے مولانا کی یہ رائے ہی کہ کفر کا فتویٰ محض شرعی حیلہ تھا "اصل بات یہ ہی کہ عالمگیر کی نظروں میں توسب سی بڑا جرم داراشکوہ کی معیت تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہی اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹکل اسباب سی ہوئی ہیں اُنھیں مذہب ہی کی چادر اُڑھا کر چھپایا گیا ہی۔ جب کوئی اور بہانہ نہ ملا تو عریانی و برہنگی کو کہ خلافِ رسمِ شرع ہی بنیاد قرار دیا اور مذکورہ بالا رباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراجِ جسمانی کا منکر ہی"۔

مولانا کے ماخذ میں تذکرہ مراۃ الخیال مصنفہ شیرخاں لودہی، تذکرہ ریاض الشعرا مؤلفہ علی قلی خاں داغستانی (یہ شخص عہدِ محمد شاہ کے امرا میں سے تھا) اور ایک بیاض قلمی جو عہدِ عالمگیر ثانی کی خوش مذاق شاعر (سراج الدین سراج) کی جمع کی ہوئی ہے۔

اس مختصر سوانح عمری کے بعد جس میں اصل حالات بہت کم ہیں رباعیاں شروع ہوتی ہیں۔ پہلے جلی قلم میں

ملنے کا پتہ شاہجہانی پریس دہلی۔ قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۱۲ر تعداد صفحات ۹۷

اصل فارسی رباعی ہے اور اُس کے بعد خفی قلم میں اردو منظوم ترجمہ ہے۔ نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اور اس میں اکثر ناکامیابی ہوئی ہے۔ کیونکہ ہر زبان کا طرزِ ادا، اسلوبِ بیاں اور محاورہ جدا ہوتا ہے۔ اسلئے اصل کی نزاکت اور قوت اور الفاظ کی ترتیب سے جو سُریلا پن پیدا ہوتا ہے وہ بیان میں نہیں آتا۔ جناب صولت صاحب نے ترجمہ میں بہت کوشش کی ہے اور جہاں تک ممکن ہوا ہے۔ خیالات کو صاف اور اچھی زبان میں موزونیت اور خوبی سے بیان کیا ہے لیکن باوجود اس کے وہ سرمد کا کلام نہیں ہو سکتا۔ صولت صاحب کا ہے اصل کی روح نقل میں نہیں ہے۔ تاہم صولت صاحب کی سعی قابلِ تعریف ہے۔ چند رباعیاں ترجمے کے ساتھ ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔ اِن سے اندازہ ہو جائیگا۔

(اصل رباعی)	(ترجمہ)
سرمد تو حدیثِ کعبہ و دیر مکن،	سرمد تو بیانِ کعبہ و دیر نہ کر
در وادیٔ شک چو گمرہاں سیر مکن،	گمراہوں کی طرح شک کی تو سیر نہ کر
ہاں شیوۂ بندگی ز شیطاں آموز	شیطان سے سیکھ بندگی کا شیوہ
یک قبلہ گزیں سجدہ بر غیر مکن	اک قبلہ بنا۔ سجدہ پئے غیر نہ کر

اے فکر گزیں خدمت شاہاں بگزیں	کر فکر نہ تو خدمت شاہاں کی کہیں
پیوستہ کسے نماند بر روئے زمیں	رہتا ہے ہمیشہ کون بر روئے زمیں
پیشانیٔ شاہاں ہمہ پُرچیں دیدم	پُرچین رہتی ہے بادشاہوں کی جبیں
دنیا نبود بقدر یک چینِ جبیں	دنیا نہیں بقدر یک چینِ جبیں

سرمد گلہ اختصار می باید کرد	ہو چکا بس شکوۂ لیل و نہار
یک کار ازیں دو کار می باید کرد	کام دو ہیں۔ کر کسی کو اختیار

یا تن برضائے دوست می باید داد
یا جان برہش نثار می باید کرد

یا سراپا بن رضائے دلربا
جان کردے یا محبت میں نثار

در مسلخِ عشق جز نکو را نہ کشند
لاغر صفتاں و زشت خو را نہ کشند
تو عاشق صادقی ز کشتن مگریز
مُردار بود ہر آنکہ او را نہ کشند

مسلخِ عشق میں اچھے ہی فنا ہوتے ہیں
قتل کب لاغر و بدکار بھلا ہوتے ہیں
تو بھی گر عاشق صادق ہے تو مرنے سے نہ ڈر
ذبح مردار کہاں، یہ تو بتا ہوتے ہیں؟

سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار
ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

کب اہل ہوس کو غم جانانہ ملا
مکھی کو نہ سوزِ دلِ پروانہ ملا
اک عمر ہے لازم پئے وصل دلدار
اس دولتِ سرمدی سے حبہ نہ ملا

در ہر گنہے فزود بخشایش جود
شرمندۂ ایں قسم نہ کرد ار نمود
خضرِ رہِ من گناہ شد آخر کار
ایں فضل و کرم چہ بود ایں جرم چہ بود

بخشش تھی زیادہ - کم ہر ایک جرم و خطا
شرمندہ نہ مجھ کو میرے کاموں نے کیا
ہر ایک گنہ نے رہبری کی آخر
کیا خوب مرا جرم - کرم ہی تیرا

نقّاش

کس قدر خوشی کی بات ہی کہ اردو رسالوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہی۔ اور بلحاظ مضامین، تحریر، اور ظاہری شان کے بھی اُن کی حالت بہتر ہی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر علمی، ادبی ذوق ترقی پر ہے۔ نقّاش بھی اردو کے جدید ماہانہ رسالوں میں سے ہی۔ پہلے رسالے کے عنوان کے نیچے "مرقع اخلاق وادب" لکھا تھا۔ اور دوسرے میں "علم وادب" یہ رسالہ اسی سال جنوری سے نکلنا شروع ہوا ہی۔ اڈیٹر جناب یوسف عزیز صاحب بدایونی ہیں۔

رسالہ کے پہلے نمبر میں سب سے اوّل اڈیٹر کا مقالۂ افتتاحیہ ہے جس میں اُنہوں نے قوموں کے اور خاص کر مسلمانوں کے زوال وعروج سے بحث کی ہی اُن کی رائے ہے کہ "نہ تو محض وہ جہل (جہل تعلیم جدید) مسلمانوں کے تنزل کا سبب ہی نہ صرف ان کی سیاسی کس مپرسی بلکہ سبب اصلی اور علۃ العلل ضعف ایمانی ہے یا ایمان مفصل کی خامی اور قوۃ عمل وجہد کا تعطّل" اس خیال کے ظاہر کرنیکے بعد وہ اپنے اس رسالہ کا مقصد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

اُس وقت ہم اپنا رسالہ نقّاس شائع کر رہے ہیں اور انھیں خیالات کے تحت میں یہ اشاعت عمل میں آرہی ہی کہ قوم کے قوائے عملی کو متحرک کرنیوالی علمی وادبی خدمت کی جائے۔ پس ہمارا رسالہ انشا اللہ تعالیٰ ایسے اخلاقی و روحانی تعلیمات اِسلامی کے مباحث پر مشتمل ہوگا جو انسان کی زندگی میں من حیث الانسان جملہ کمالات وترقی کے ضامن ہیں"۔

لیکن رسالہ بھر میں اس مقصد کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔

دوسرے نمبر میں قابل اڈیٹر نے "ایک مسئلۂ ضروری" کے عنوان سے رسالہ کے شروع میں ایک بہت اچھا مضمون اُردو کے رسالوں پر لکھا ہی جو اُن تمام اصحاب کے پڑھنے کے قابل ہی جن کا تعلق رسالوں کی اشاعت وترتیب سے ہے، خصوصًا بعض عنوانوں کی لفظی ترکیب پر پُر لطف نکتہ چینی کی ہی۔ اس تمام بحث کے آخر میں لکھتے ہیں کہ " اب صرف

علوم کا سوال رہجاتا ہی۔ اوران ہی مضامین کی سب سے زیادہ ضرورت بھی ہوتی ہی۔ لیکن علوم متداولہ کی کامل اورمسلسل تکرار نہ تو ممکن ہی نہ تقاضے کا یہ منشا اور نہ عامۃ الناس میں ایسی گہری دلچسپی البتہ علوم کی آسان آسان فروع اور دلچسپ وکارآمد متشعبات کو مخصوص اسالیب ایجاز کے ساتھ مبحث قرار دیا جاسکتا ہی۔ اس میں بھی خاصکر وہ حصّہ جو ہمیشہ علمائے فنون کے زیر غور وتحقیق رہتا ہی رسائل کے لئے مناسب موضوع ہے"

نقاش بھی اپنے لئے یہی موضوع قرار دیتا ہی ان دونوں مضمونوں کے پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ نقاش نے اپنے لئے دو موضوع قرار دئے ہیں۔ ایک تو اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیم اور دوسرا علمی مسائل کی تحقیق پسندیدہ اسلوب سے۔ لیکن ان دونوں رسالوں میں اس قسم کے مضامین مفقود ہیں۔ خود اڈیٹر صاحب نے ذیل کے الفاظ میں اس کے متعلق معذرت کی ہی اسلئے کسی تنقید کی ضرورت نہیں۔

"نقاش کے پیش نظر بھی ایسا ہی کچھ نصب العین ہی تاہم یہ اعتراف ہم ضرور کرینگے کہ موجودہ ابتدا میں مکمل معیار پیش کرنے کے لئے مقامی بے سروسامانیاں اور گردوپیش کی الجھنوں سے سابقہ ناگزیر ہے اور ایک مدّت تدریجی درکار ہی جو چندماہ کا معاملہ ہے۔ عزم کے رسوخ میں بفضلہ کوئی بے اطمینانی نہیں۔ انشاءاللہ مستقبل ملحق میں نقاش شاہراہ ترقی پر ہوگا"

ہمیں اُمید ہے کہ اس ہونہار رسالہ کو اپنے مقاصد میں کامیابی ہوگی اور آئندہ ایسے سامان بہم پہنچ جائیں گے کہ وہ اپنے نصب العین کو پورا کرسکے۔ اب بھی اس میں نظم ونثر کے ایسے مضامین موجود ہیں جنھیں وہ اصحاب جن کو خالص علمی اور تحقیقی یا تنقیدی مضامین پڑھنے میں الجھن ہوتی ہی، شوق سے پڑھینگے۔ [۱]

---

[۱] قیمت سالانہ للعہ، بدایوں

نگار[1]

یہ جدید علمی و ادبی، ماہانہ رسالہ فروری سنہ رواں سے شائع ہونا شروع ہوا ہے، جو اردو رسالوں میں قابل قدر اضافہ ہے۔ "رئیس التحریر" جناب نیاز فتحپوری اور "معاون مدیر" جناب مخمور اکبرآبادی ہیں؛

جناب نیاز کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ اردو علم ادب میں بحیثیت نثار و ناظم کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور اس لئے یہ توقع ہے کہ اُن کی زیرِ ادارت یہ رسالہ فروغ پائیگا۔

بخلاف دوسرے رسالوں کے اس میں یہ نئی بات ہے کہ یہ ایک جماعت یا کمپنی کے مشترکہ سرمایہ سے جاری ہوا ہے۔ دوسرے اس کے شعبۂ ترتیب اور شعبۂ نشر و انتظام الگ الگ ہیں۔ شعبۂ ترتیب جناب "رئیس التحریر" کے تحت میں بھوپال میں ہے اور شعبۂ نشر و انتظام آگرہ میں۔

تمہیدی مضمون میں جو "عناصر نگار" کے نام سے پہلے رسالہ کے شروع درج ہے۔ نگار کے مقاصد پر بھی بحث کی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں "عہد حاضر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ اس کا مذاق زیادہ وزنی ہوتا جاتا ہے اور وہ تمام قوتیں جو اب سے قبل سطح پر تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں، اب عمق کی طرف مائل ہیں، جس کا حال ہمیں بھی اپنے تئیں غرق کر دینے ہی کے بعد معلوم ہوتا ہے"

اس لئے یہ رسالہ خالص ادبی رسالہ نہ ہوگا "کیونکہ ادب کی وہ مانگ جو چند سال پیشتر تھی، باقی نہیں رہی" اسلئے "رئیس التحریر" صاحب نے "اس کو مناسب نہیں سمجھا کہ جو تفریح تماشا کرنے والوں کی کثرت سے اس درجہ پامال اور عام ہو چکی ہے اُسے پھر پبلک کے سامنے پیش کروں" لہٰذا "ادبِ لطیف" اس رسالہ کے موضوع سے خارج ہوگا رہی سیاست تو "چونکہ موجودہ انقلاب پسندی کے جذباتِ سریع کے لحاظ سے ایک ماہوار رسالہ بقدرِ "لذتِ کام و دہن" بھی کوئی سامان فراہم نہیں کر سکتا، اس لئے اسے بالکل ترک کر دینا پڑا۔ کیونکہ میری رائے میں یہی وہ چیز

---

[1] تقطیع اردو کی صفحات ۸۰ سالانہ چندہ پانچ روپیہ۔ حافظ امام الدین صاحب منٹولہ آگرہ سے ملسکتا ہے

جو رقابت سے سخت بیزار ہی - ہو تو سب کچھ ہی ورنہ بالکل نہ ہو"

"اب رہ گئیں دو قسمیں علم و تاریخ کی ۔ سو ان کا اختیار کرنا ضروری تھا۔ کسی قوم یا ملک کے مذاق میں خوشگوار تبدیلی اُسی وقت ہو سکتی ہی جب اُس کے معلومات وسیع ہوں - اور اس کا بہترین ذریعہ یہی ہی کہ نہایت حریصانہ طریقہ سے اردو میں علم تاریخ کا اتنا اور ایسا مواد فراہم کیا جائے کہ معمولی اردو داں طبقہ بھی اس سی محروم نہ رہی"

یہ درست ہی کہ یک علمی و تاریخی رسالہ میں سوائے خشک مضامین کے اور کچھ نہیں۔ لیکن اوّل تو اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ یہ رسالہ اس حد تک نہ پہنچنے پائے اور اگر موضوع کے لحاظ سی کوئی مضمون ایسا نظر آجائے تو اُس کو دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اصل مقصود آپ میں اسی ذوق کا پیدا کرنا ہی -

رسالہ کا ایک حصّہ بالالتزام ادبی مضامین کے لئے بھی وقف ہوگا۔ لیکن اُس میں وہ تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی شامل ہونگے جو افسانوں سے علٰحدہ ہیں لیکن ہیں ادب ہی سے وابستہ نظمیں بھی ہونگی مگر مخصوص معیار کی

معلومات کا ایک حصّہ جدا رہیگا جس کے ذریعہ سے کوشش کی جائیگی کہ بہترین اطلاعات (تاریخی و علمی) آپ کی نگاہوں سے گذرتی رہیں۔ فنون لطیفہ کے متعلق بہترین تصاویر بھی شائع ہوتی رہینگی"

ہم نے رسالہ کے مقاصد کے متعلق خود جناب رئیس التحریر صاحب کی عبارت نقل کردی ہی تاکہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہی یہ ظاہر ہے کہ یہ مقاصد نہایت پسندیدہ اور لایق تحسین ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اُن کو عمل میں لانے کی کوشش بھی کی گئی ہی تاہم رسالہ "ادب لطیف" سے خالی نہیں ہی اور اگر اس کے معنی ذرا وسیع کردئے جائیں تو رسالہ کا معتدبہ حصّہ اسی میں آجاتا ہی"

رئیس التحریر حضرت نیاز فتحپوری کا طرز تحریر ایک خاص شان رکھتا ہی۔ ہم ناظرین کے اضافۂ علم اور اطلاع کے لئے عبارت کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔

"اس میں شک نہیں کہ اِس وقت، جبکہ سیاسی امیال و عواطف نے، زندگی کے تمام لذیذ و دلچسپ مشاغل کو (شاید بجا طور پر) پس پشت ڈالدیا ہی، اور علی الخصوص اس وقت جب کہ طباعت اور کاغذ کی گرانی نقطۂ عروج کی

"گلہ فگن" حد تک پہنچ گئی ہے۔ کسی رسالہ کا اور رسالہ بھی وہ جو سیاسیات کے شجر ممنوع تک پہنچنے کی جرأت نہیں کر سکتا،
جاری کرنا بیش بیں اور مصلحت اندیش نگاہوں کے نزدیک کچھ امید افزا بات نہیں ہو سکتی، لیکن اس کا کیا علاج کہ ہم اپنی
جس آرزو کو مستقبل کے خوشگوار منظر و حالات سے وابستہ کرتے ہیں، وہ مستقبل کے اسی نقطہ پر پہنچ کر محسوس کرتی ہے
کہ "ماضی" اس سے بہتر تھا۔ پھر جب یہ تجربہ تواتر کی حد تک پہنچ جائے اور زمانہ آیندہ کے تمام نقوش پے در پے اس
طرح مبتلائے فریب رکھنے والے ثابت ہوتے رہیں، تو کب تک کوئی انتظار کر سکتا ہے۔ آخر کار مجبور ہو کر اُسے کہدینا
پڑتا ہے۔

"مرغابی شو کہ کار با طوفان ست"

ممکن ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اس کی داد دیں، لیکن "معمولی اردو داں طبقہ" اس سے مستفید نہیں ہو سکتا۔
پہلے رسالہ میں "اشتراکیت (Socialism) پر اور دوسرے رسالہ میں فوضویت (Anarchism)
پر دو علمی مضمون "رئیس التحریر" حضرت نیاز کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دو ایسے مبحث ہیں
کہ ان پر اردو زبان میں لکھنا اور اُن کے اصل مفہوم اور منشا اور اصول اور اُن کے پیدا ہونے کے اسباب پر بحث
کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور ہمیں خوشی ہوئی کہ حضرت نیاز نے سب سے اوّل ان پر لکھنے کی زحمت گوارا کی۔ لیکن اس
کے ساتھ ہمیں اس کا بھی افسوس ہے کہ یہ مضامین بہت مختصر، سرسری، اور غیر مکمل ہیں۔ یہ زیادہ تفصیل اور خوبی اور لطف
کیساتھ لکھے جا سکتے تھے جس سے معمولی اردو داں طبقہ" بھی لطف حاصل کر سکتا اور اُن کے اصول کو بخوبی سمجھ سکتا۔ پہلا
مضمون صرف ساڑھے تین صفحہ پر ہے اور دوسرا سات صفحہ پر۔
فوضویت بہت ہی ثقیل اور غیر مانوس لفظ ہے۔ انارکزم کا مفہوم نہایت آسانی اور خوبی سے لفظ مزاج سے
ادا ہو سکتا تھا۔ جو بہت ہی عام فہم اور سہل ہے۔
اردو کے مشہور علمی رسالہ معارف کے تتبع میں معلومات کے لئے بھی چند صفحات وقف ہیں۔ جو بہت کارآمد
چیز ہے۔

رسالہ کے آخر میں "یارانِ نجد" کے عنوان کے تحت میں چند صفحہ ہیں۔ اُس کے رموز و اشارات صرف "بزمِ نگار" کے ارکان ہی سمجھ سکتے ہیں غیر ان اسرار کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

نظم کا حصہ بھی معقول ہی پہلے رسالہ میں آٹھ نظمیں ہیں اور دوسرے میں پانچ۔ فسانے بھی چار سے کم نہیں۔

غرض یہ رسالہ خاص رنگ رکھتا ہی اور علمی و ادبی لحاظ سے قابل قدر ہی۔

دی ٹیچر

منشی کا لفظ ہماری زبان میں بہت معزز خیال کیا جاتا تھا اور قابل انشا پردازوں کے ناموں کے ساتھ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ، علامہ ابوالفضل جیسے شخص کی تعریف میں بھی منشی کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ حال کے زمانہ میں شمس العلماً خان بہادر ذکاءاللہ مرحوم آخر وقت تک منشی ذکاءاللہ کہلائے اور اسی طرح غلام غوث خاں صاحب بیخبر مرحوم (میر منشی لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی)، منشی کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ جب سے اس ملک میں انگریزی تسلط ہوا اور انگریز صاحبان کو ملک کی زبان سیکھنے کی ضرورت ہوئی تو منشی کی وقعت جاتی رہی اور یہ خاص فرقہ ہو گیا جس کا پیشہ "صاحب لوگوں" کو اردو فارسی پڑھانا ہے۔ عام طور پر منشیوں کی لیاقت (باستثنائے معدودے چند کے) معمولی ہوتی ہی اور اُس کے ساتھ وہ انگریزی بھی شدھ بدھ جانتے ہیں کیونکہ صاحب لوگوں کو پڑھانے کے لئے تھوڑی بہت انگریزی جاننی بھی ضروری ہے۔ پیشہ کی ضرورت اور صاحب لوگوں کی صحبت سے ان میں کسی قدر انگریزیت بھی آجاتی ہی۔ یہی خصوصیت ہم ان حضرات کے رسالہ "دی ٹیچر" میں دیکھتے ہیں جو اس کے نام اور ترتیب سے ظاہر ہے یہ رسالہ زیر ادارت منشی محمد اکبر خاں حیدری۔ ایم۔ آر۔ ایس دہلی سے شائع ہوتا ہی۔ اس کے دو حصے ہیں ایک اردو دوسرا انگریزی۔ اردو حصہ میں منشی صاحبان کے حالات، اُن کی مشکلات، طریقہ تعلیم، اور اردو زبان کے متعلق بعض مضامین ہیں۔ انگریزی حصے میں امتحانات کے اردو پرچے، اردو صرف و نحو، اور زبان کے متعلق ہدایات، اصول تعلیم، اور منشیوں اور صاحبوں کے تعلقات پر تحریریں شائع کی گئی ہیں۔

درحقیقت منشیوں کا فرقہ بہت قابل رحم ہی۔ اس کا پیشہ جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے آسان نہیں ہی۔ بلکہ بہت کٹھن اور بے مزہ ہی اس کی معاش کا انحصار زیادہ تر فوجی انگریز عہدہ داروں کو پڑھانے پر ہی جہاں اُستادی شاگردی کے

تعلقات کا کوئی لحاظ نہیں ۔ عام طور پر صاحب اپنے منشی کو بھی ایک شاگرد پیشہ ہی سمجھتا ہی ۔ تنخواہ بیس تیس بہت ہوئی تو چالیس پچاس ۔ پڑہانے کا وقت دنیا سے نرالا ۔ جب صاحب اپنے فرائض منصبی اور کھانے پینے سے فارغ ہوا تو کتاب لیکر بیٹھتا ہی ۔ ایک تو منشی صاحب کا طریقہ تعلیم عجیب و غریب دوسرے صاحب کی سمجھ اوندھی طبیعت پہلے سے تھکی ہوئی اور اُس پر گرمی کی تپش اور غنودگی کا زور ۔ بار بار جھنجلاتا ہی اور کتاب ٹپک ٹپک دیتا ہی ۔ جی دونوں کا نہیں لگتا ۔ اسے پڑھنے کا شوق نہ اُسے پڑھانے کا ۔ مجبوری سے پڑہتا ہی کیونکہ کامیابی پر ترقی کا دارومدار ہے ۔ منشی صاحب بھی یہی چاہتے ہیں کہ کچھ بھی ہو امتحان میں کامیاب ہوجائے امتحان کی کامیابی پر نقد انعام ملتا ہی اور اس میں منشی صاحب کا بھی حصّہ ہوتا ہی ۔ بیچارہ منشی عمر بھر اسی کوچہ میں گشت لگاتا رہتا ہے اور حیران و پریشان رہتا ہے ۔ بعض اوقات اُسے منشی گری کی تلاش میں مارا مارا پھرنا پڑتا ہی ۔ غرض کہ اُس کا ذوق ، اُس کا میلان طبع اور اُس کی ساری زندگی عجیب قسم کی ہوجاتی ہے جسے دنیا کے دوسرے معاملات اور حالات بہت کم تعلق ہوتا ہی یہی وجہ ہے کہ ہم اُس کی زندگی کو قابل رحم خیال کرتے ہیں ۔ ہمیں اس سے دلی مسرّت ہوئی کہ منشی صاحبان کو اپنے پیشہ کی وقعت کا خیال پیدا ہوا ہی اور اسی غرض سے اُنھوں نے یہ رسالہ جاری کیا ہی جس کا مقصد یہ ہے کہ باہم اتحاد پیدا کریں ، اپنا وقار قائم کریں ، لیاقت بڑھائیں ، طریقہ تعلیم میں اصلاح کریں اور استاد شاگرد (منشی اور صاحب) کے تعلقات خوشگوار بنائیں اُن کے مدنظر صرف امتحان ہی نہ ہو بلکہ طرفین اپنا اپنا کام شوق اور دل سے کریں ۔ یہ بہت اچھے مقاصد ہیں اور ہمیں منشی صاحبوں سے کامل ہمدردی ہی لیکن اُن سے ہماری یہ عرض بھی ہی کہ وہ اپنی تمام عمر اسی تنگ کوچہ میں نہ بسر کردیں بلکہ اپنی نظر زیادہ وسیع اور بلند کرنے کی کوشش کریں ۔

رئیس ہند[1]

یہ ماہانہ رسالہ سب سے نرالا ہی ۔ یہ صرف ہندوستانی ریاستوں کے متعلق لکھتا ہے ۔ دیسی ریاستوں کا اور اُن سے بڑھکر حکومت برطانیہ کا خیر خواہ ہی تمام خبریں اور مضامین ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق دیسی ریاستوں

---

[1] ملنے کا پتہ ۔ منیجر رسالہ رئیس ہند ۔ بھگونت آشرم پٹیالہ قیمت عام خریداروں سے آٹھ روپیہ سالانہ ۔ جائے اشاعت دہلی

سے ہے ۔مگر کوئی بات ایسی نہیں لکھتا کہ کوئی رئیس ناراض ہو ۔ بلکہ جو لوگ اس قسم کی تحریر شائع کرتے ہیں اُن کی خوب خبر لیتا ہی یہانتک کہ بعض وقت گالیوں پر اُتر آتا ہے آج کل ملک میں جو سیاسی تحریکیں پائی جاتی ہیں اُن کا سخت مخالف ہی اور اُن کے بانیوں کو سخت سست اور بے نقط سناتا ہی ۔ ہر رسالہ میں کسی نہ کسی راجہ مہاراجہ یا نواب کی سوانح عمری ہوتی ہی ۔ ان رئیسوں میں سے کسی نہ کسی رئیس کی تصویر بھی ہوتی ہی ۔ ایک پرچہ بالکل ہزرائل ہائی نس پرنس آف ویلز کی سیاحت ہند اور ان کی تقریروں کے لئے وقف کر دیا ۔ اس رسالہ میں ایک عنوان "ہماری حاصل شدہ سوراج" کے نام سے رہتا ہی جس کے تحت ریاستوں کی مختلف خبریں درج رہتی ہیں ۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو ۔ جو لوگ دیسی ریاستوں کی اچھی خبریں سننے کے مشتاق ہیں اُن کے لئے یہ رسالہ مغتنمات میں سے ہے ۔ ہمارے پاس پانچ رسالے پہنچے جن میں ایک تو جنوری کا ہی باقی دو دو ماہ کے ساتھ شائع ہوئے ہیں ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا ہی ۔

فہرست کتب

(سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو)

البیرونی کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہے ی کا فاضل ہے مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ تاریخ اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی البیرونی اس کے حالاتِ زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے۔ قیمت عہ

فلسفۂ اجتماع تالیف ہے اور اس کا موضوع نفس اجتماعی جماعت کے لیے اعمال و قوائے دماغی کے تحلیل و تشریح ہے موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور فائدے سے خالی نہو گا۔ اِس پر انگلستان و ہند کے علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ عہ

قاعدہ و کلیدِ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے۔ ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی نے اپنے صوبہ کے گورنر سے تحریک کی ہے کہ اس قاعدہ کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ جن اُصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیے اُن کی تشریح کے لیے ایک کلید بھی تیار ہے۔ قاعدہ ۲ر کلید قاعدہ ہر

دریائے لطافت ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشا اللہ خاں کی تصنیف ہے اُردو صرف و نحو اور محاورات و الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں۔ عہ

طبقات الارض۔ اس فن کی پہلی کتاب ہے تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند ہیں انگریزی اور اُردو داں دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک کر دی گئی ہے۔ قیمت عہ

مشاہیر یونان و روما۔ پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہے سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادیبانِ عالم بلکہ شکسپیر تک نے اِس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔ وطن پرستی و بے نفسی، عزم

وجواںمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ لبریز
ہی۔ ہماری قوم کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں اس کا
ایک نسخہ ضرور ہونا چاہیے۔ دُنیا کی تمام مہذّب زبانوں
میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہی۔ جلد اوّل غیر مجلد ۲؏ ر
جلد دوم مجلد ۲؏

اسباقِ نحو دو حصے ملک کے ادیب کامل مولٰنا
مولوی حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف سے
ہیں۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک
ضروری مسئلہ درج ہی عربی خواں طلبار کے لیے
نادر تحفے ہیں قیمت فی رسالہ ۸ر

علم المعیشت۔ اسرارِ تمدن کے سمجھنے کے
لیے اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس
برنی صاحب ام اے نے ملک پر بڑا احسان کیا ہے
حجم (۵۲۸) صفحے قیمت صرف للعہ ر

تاریخ اخلاقِ یورپ اصل مصنف لیکی کا
نام علم و تبحر تحقیق و صداقت کا مرادف ہی یہ کتاب
کئی ہزار برس کے تمدن و معاشرت اُصول اخلاق
مذہب و خیالات کا مرقع ہی۔ ترجمہ مولوی عبد الماجد
صاحب بی اے۔ حصہ اوّل مجلد ہے، دوم مجلد ہے ر

مبادیِ سائنس فرانسیسی سے انگریزی اور
انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی گئی ہی اس کا بیان
سلیس اور مقبول عام ہی اُردو ترجمہ صرف ایک حصہ
کا ہے اور آخر کتاب میں فرہنگ مصطلحات بھی ہی
قیمت ۲؏ر

تاریخ یونانِ قدیم۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ
سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہی اور زبان کے لحاظ
سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ اِس کا نقطۂ خیال خالصتًا
ہندی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلبہ، جو یونانِ
قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجے
مفید پائینگے۔ مجلد قیمت ۲؏ر

انتخابِ کلامِ میر۔ میر تقی سرتاج شعرائے اُردو
کے کلام کا انتخاب ہی مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری
انجمن ترقی اُردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت
کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات
شاعری پر ۲۴۰ صفحے کا ایک مقدمہ بھی ہی قیمت عہ ر

رسالۂ نباتات۔ اِس موضوع کا پہلا رسالہ ہی علمی
اصطلاحات سے معرا۔ سلاست روانی مملو اور دلچسپ
و مفید ہی۔ طلبار نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ

سمجھ سکیں وہ اسی رسالہ میں مطالعہ کریں۔ قیمت مجلد عہ

دیباچۂ صحت - اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا، پانی، غذا، لباس وغیرہ پر مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے زبان عام فہم اور پیرایہ مؤثر و دل پذیر ہے۔ ملک کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کا مطالعہ طبیبوں کے کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ حجم ۵۰۰ صفحے مجلد قیمت للعہ

قواعد اُردو ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اُردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھی گئی بسیط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے اس کو ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بمبئی نے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے قیمت عا

القول الاظہر ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف الفوز الاصغر کا اُردو ترجمہ ہے۔ ابن مسکویہ آسمان علم و فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ انھیں کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں کے لیے تجویز کیا ہے۔

قیمت عہ

اُمرائے ہنود - پانسو سے زیادہ ہندو امرا کے حالات قلم بند ہیں۔ یہ اُمرا سلاطین مغلیہ کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے کتاب گویا ان متعصب اور ناواقف مورّخوں کا جواب ہے جو اسلامی حکومت پر تعصّب کا الزام لگاتے ہیں

قیمت حصہ اول عا، حصہ دوم عہ

القمر - قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت اور چاند کے متعلق جتنی جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے۔ قیمت ۸

تاریخ تمدّن - سرٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے الف سے یے تک تمدّن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے۔ ہر بحث کے لئے ایک دلچسپ مگر پُر زور اُصول اختیار کیا گیا ہے اور ہر اُصول کی تائید میں تاریخی نقد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لیے تجویز کی گئی ہے قیمت حصہ اوّل غیر مجلد عہ حصہ دوم مجلد ۶

مقدماتُ الطبیعات۔ یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے۔ اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے۔ متعلمان سائنس اور عام شائقین کے لیے بہت مفید ہے۔ قیمت عہ

فلسفۂ جذبات۔ کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ قیمت عہ

نکات الشعرا، یہ اردو شعرا کا تذکرہ میر تقی میر کی تالیفات سے ہے اس میں میر صاحب کی رائے اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت سے

نپولین اعظم ایبٹ کی مستند کتاب کا اردو ترجمہ ہے کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری جدوجہد کا آخری باب ہے، واقعات کی داد یا تو سکندر کی زبان ادا کر سکتی ہے یا تیمور کی زبان ترجمہ آسان اور عام فہم ہے مکمل پانچ جلد قیمت ۱۲

فلسفۂ تعلیم۔ ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ اور والدین و معلم کے لیے چراغ ہدایت ہے تربیت کے زبانی قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے قیمت سے

رہنمایانِ ہند۔ مشہور کتاب پروفٹس آف انڈیا کا ترجمہ ہے شروع میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہے اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج کی سوانح اور گوتم بدھ کے پر اثر حالات آتے ہیں۔ آخری حصہ میں شنکرا چارج رامانج اور رامانند کا ذکر ہے قیمت عہ

آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اُردو

۱- انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا

۲- یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔ حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحے ہوگا

۳- قیمت ؁ سالانہ مع محصول ڈاک اور ارکانِ انجمن ترقی اُردو سے ؁

۴- تمام خط و کتابت :- آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہیئے

(باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)